محاسنِ خطوطِ غالب

مع

انتخابِ خطوطِ غالب

تالیف:

ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار

پیش کش:

بزمِ اقبال ، لاہور

محاسنِ خطوطِ غالب

مع

انتخابِ خطوطِ غالب

تالیف :

ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار

پیش کش :

بزمِ اقبال ، لاہور

جملہ حقوق محفوظ ہیں

ناشر :	پروفیسر ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار اعزازی سیکرٹری بزمِ اقبال "نرسنگداس گارڈنز" ۲-کلب روڈ-لاہور فون:6363056
کمپوزنگ :	ا-ریاض احمد صاحب ۲-پرل کمپوزنگ سنٹر لاہور (فائنل)
مطبع :	حاجی محمد حنیف اینڈ سنز پرنٹرز لاہور
اشاعت :	مارچ ۲۰۰۳ء
تعداد :	۱۱۰۰ (ایک ہزار ایک سو)
صفحات :	۲۰۸
قیمت :	-/۱۴۰ روپے

ISBN 969-8042-27-X

یہ منصوبہ حکومتِ پنجاب کی مالی معاونت سے تکمیل پذیر ہوا

فہرست مضامین

پیش لفظ ۵ - ۶
اقبال اور مرزا غالب

حصہ اوّل

غالب خستہ کے بغیر ۹ - ۱۵

حصہ دوم

خطوط غالب کے مجموعے ۱۸-۴۲
غالب کی اردو نثر ۲۶-۴۳
محاسنِ خطوط غالب ۴۴-۶۷
غالب کا اجتماعی احساس ۶۸-۸۱

حصہ سوئم

الف - انتخاب خطوط غالب ۸۳
۱۔ نواب امین الدین احمد ۸۴
۲۔ علاؤ الدین احمد علائی ۸۶
۳۔ میرزا شہاب الدین احمد ثاقب ۱۰۴
۴۔ میرزا قربان علی بیگ سالک ۱۰۵
۵۔ منشی ہرگوپال تفتہ ۱۰۶

۶۔ مرزا حاتم علی بیگ مہر	۱۳۰
۷۔ منشی شیونرائن آرام	۱۴۱
۸۔ میر مہدی حسین مجروح	۱۴۴
۹۔ خواجہ غلام غوث خاں بیخبر	۱۶۸
۱۰۔ انور الدولہ نواب سعد اللہ خاں شفق	۱۷۱
۱۱۔ حکیم غلام نجف خاں	۱۷۴
۱۲۔ نواب یوسف مرزا	۱۷۷
۱۳۔ نواب میر غلام بابا خاں	۱۸۱
۱۴۔ نواب ابراہیم علی خاں وفا	۱۸۲
۱۵۔ حکیم سید احمد حسن مودودی	۱۸۲
۱۶۔ تفضل حسین خاں	۱۸۴
۱۷۔ میاں داد خاں سیاح	۱۸۴
۱۸۔ میر حبیب اللہ ذکا	۱۹۱
۱۹۔ چوھدری عبدالغفور سرور	۱۹۲
ب۔ تشریحات	۱۹۵-۱۹۸
ج۔ مکتوب الیہم کا مختصر تعارف	۱۹۹-۲۰۴

☆☆☆☆☆☆☆

پیش لفظ

۱۹۶۹ء میں مرزا اسد اللہ خاں غالب کے صد سالہ جشن ولادت کے موقع پر راقم نے ایک حقیر سا نذرانۂ عقیدت "محاسن خطوطِ غالب" کے عنوان سے پیش کیا تھا جس میں چند مقالات مرزا غالب کی نثری نگارشات کے سلسلے میں (۱۔ خطوط غالب کے مجموعے ۲۔ غالب کی اردو نثر ۳۔ محاسن خطوطِ غالب ۴۔ غالب کا اجتماعی احساس) کے علاوہ ۱۱۸ خطوطِ غالب کا ایک انتخاب بھی دیا گیا تھا۔ پاکستان اور بھارت کے ادبی حلقوں میں اس تالیف کو پسند کیا گیا اور خصوصاً طلبہ کے لیے مطالعہ غالب کے ضمن میں یہ مجموعہ از حد معاون و مددگار ثابت ہوا۔ اس کا واحد ایڈیشن ایک ہزار کی تعداد میں فروری ۱۹۶۹ء میں خوبصورت ٹائپ کے حروف میں مکتبۂ خیابانِ ادب لاہور نے چھپوایا تھا اور ارزاں قیمت پر فروخت کیا تھا' اور یہ نسخہ جلد ہی نایاب ہو گیا۔ مکتبۂ خیابانِ ادب بھی اس ارزانی کی پاداش میں حوادثِ زمانہ کی نذر ہو گیا' اور میں بھی دوسرے تدریسی و تالیفی کاموں میں مصروف رہا۔ اور اگر چہ غالب کا خیال لوحِ ذہن سے محو تو نہیں ہوا مگر بقول انہی کے:

غالبؔ خستہ کے بغیر کون سے کام بند ہیں
روئیے زار زار کیا کیجیے ہائے ہائے کیوں؟

ایک زمانہ بیت گیا۔ اس دوران ایک آدھ مضمون بھی غالب کے بارے میں لکھ سکا اور یہ غالباً ۱۹۸۰ء میں لکھا گیا تھا اور "فنون" میں شائع ہوا، اور اس کا عنوان بھی یہی تھا: "غالبؔ خستہ کے بغیر!" اب ۳۳،۳۴ سال کے بعد اپنے نئے مسکن میں کتابوں کو شیلفوں میں ترتیب دیتے وقت "محاسن خطوطِ غالب" کا ایک پرانا نسخہ نظروں کے سامنے آ گیا اور یہ کہہ کر میرا منہ

چڑانے لگا، ''واہ جی واہ! آپ تو ہمیں بھول ہی گئے!'' مَیں بہت نادم ہوا۔ اس ندامت کے احساس نے مجبور کیا کہ فوری طور پر اس نسخے کی طباعت کا بندوبست کروں۔ چنانچہ ۱۹۸۰ کے لکھے ہوئے مضمون کو اس طباعت میں شامل کر کے اب اس کا عنوان بھی دوہرا کر دیا ہے: ''غالب خستہ کے بغیر'' حصہ اول۔ ''محاسن خطوطِ غالب'' حصہ دوم اور ''انتخاب خطوطِ غالب'' حصہ سوئم۔

اتفاق سے انہی دنوں بعض پاکستانی یونیورسٹیوں کے اساتذہ' جن کے نصابات ایم۔اے اُردو میں مرزا غالب کی نثر اور شاعری کا خصوصی مطالعہ شامل ہے' محاسن خطوطِ غالب کی تلاش میں میرے پاس بزمِ اقبال میں تشریف لائے اور غالب کی نثر کے خصوصی مطالعے کے اس سلسلے میں متذکرہ بالا تالیف کی نایابی کا تذکرہ کیا' مجھے احساس ہوا کہ واقعی یہ کتاب جو مَیں نے اپنے طلبہ کی سہولت کی خاطر ہی ۳۰' ۳۵ سال قبل لکھی تھی، اس کی اب ضرورت محسوس کی جا رہی ہے۔ چنانچہ مَیں نے اس کی فوری کمپوزنگ اور طباعت کی ذمہ داری اپنے ایک دوست اور کرم فرما کے سپرد کی، مگر اس میں بھی کچھ تاخیر ہو گئی۔ بہر کیف بقول غالب اس میں کوئی حکمت تھی:

ہُوئی تاخیر تو کچھ باعثِ تاخیر بھی تھا

امید ہے قارئین اور خصوصاً طلبہ (جن کی خاطر، اپنے استادِ گرامی ڈاکٹر سید عبداللہ مرحوم کے نقشِ قدم میں مَیں بھی مدرسانہ تحقیق و تنقید کو اپنا سرمایہء افتخار سمجھتا رہا ہوں) اِس طباعتِ ثانی کو پسند فرمائیں گے۔

محاسن خطوط غالب کا یہ اضافہ شدہ اڈیشن بزم اقبال کے اہتمام میں شائع ہو رہا ہے' اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ پہلے غالب سے اقبال کے ذہنی تعلق اور واسطے کو بھی واضح کر دیا جائے۔ اس لیے اگلے صفحے پر ایک مختصر تعارفی مضمون ''اقبال اور مرزا غالب'' پیش کیا جا رہا ہے۔ والسلام

(پروفیسر ڈاکٹر) غلام حسین ذوالفقار

اقبال اور مرزا غالب

اُردو شاعری میں اقبال کے پیش روؤں میں مرزا غالب کا شمار سرِفہرست ہے۔ اقبال' غالب کی شاعری اور نثر سے طالب علمی کے زمانے ہی سے متاثر تھے۔ اِس تاثر کا بیّن ثبوت اُن کی نظم "مرزا غالب" ہے جو "مخزن" کے شمارے ستمبر ۱۹۰۱ء میں یعنی آج سے ایک صدی پیشتر شائع ہوئی تھی' اور پھر "بانگ درا" (اشاعت اوّل ۱۹۲۴ء) کے مجموعے میں "ہمالہ" کے بعد شروع میں آتی ہے' اور غالب سے اقبال کا ذہنی رشتہ "جاوید نامہ" (اشاعت اول ۱۹۳۲ء) تک جاری رہتا ہے۔ یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ اِس ذہنی رشتے کے حوالے سے اسی اوّلین نظم "غالب" میں ہم "اقبال' غالب اور گوئٹے" کو بھی ہم نوا دیکھتے ہیں۔

اس لحاظ سے مَیں اپنی تالیف "محاسن خطوطِ غالب" کو علامہ اقبالؒ سے معنون کرتا ہوں' اور ذیل میں افتتاحیہ کے طور پر حضرت علاّمہ کی یہ نظم درج کی جاتی ہے جو غالب کی فکری و فنی خوبیوں کا اعتراف بھی ہے اور اظہار بھی:

مرزا غالب

فکرِ انساں پر تری ہستی سے یہ روشن ہُوا ۔۔۔ ہے پرِ مُرغِ تخیّل کی رسائی تا کُجا

تھا سراپا رُوح تُو' بزمِ سخن پیکر ترا ۔۔۔ زیبِ محفل بھی رہا محفل سے پنہاں بھی رہا

دید تیری آنکھ کو اُس حُسن کی منظور ہے

بن کے سوزِ زندگی ہر شے میں جو مستور ہے

محفلِ ہستی تری بربط سے ہے سرمایہ دار　　جس طرح ندی کے نغموں سے سکوتِ کوہسار
تیرے فردوسِ تخیل سے ہے قدرت کی بہار　　تیری کشتِ فکر سے اُگتے ہیں عالم سبزہ دار

زندگی مضمر ہے تیری شوخیِ تحریر میں
تابِ گویائی سے جُنبش ہے لبِ تصویر میں

نُطق کو سَو ناز ہیں تیرے لبِ اعجاز پر　　محوِ حیرت ہے ثریا رفعتِ پرواز پر
شاہدِ مضموں تصدق ہے ترے انداز پر　　خندہ زن ہے غنچۂ دلّی گُلِ شیراز پر

آہ! تُو اُجڑی ہوئی دِلّی میں آرامیدہ ہے
گُلشنِ ویمر میں تیرا ہم نوا خوابیدہ ہے

لُطفِ گویائی میں تیری ہمسری ممکن نہیں　　ہو تخیل کا نہ جب تک فکرِ کامل ہم نشیں
ہائے! اب کیا ہوگئی ہندوستاں کی سرزمیں　　آہ! اے نظارہ آموزِ نگاہِ نکتہ بیں

گیسوئے اُردو ابھی منّت پذیرِ شانہ ہے
شمع یہ سودائیِ دلسوزیِ پروانہ ہے

اے جہان آباد! اے گہوارۂ علم و ہُنر　　ہیں سراپا نالۂ خاموش تیرے بام و دَر
ذرّے ذرّے میں ترے خوابیدہ ہیں شمس و قمر　　یُوں تو پوشیدہ ہیں تیری خاک میں لاکھوں گُہر

دفن تُجھ میں کوئی فخرِ روزگار ایسا بھی ہے؟
تجھ میں پنہاں کوئی موتی آبدار ایسا بھی ہے؟

☆☆☆

غالبؔ خستہ کے بغیر!

عصرِ رواں کا سلسلہ دراز ہے۔ لمحے ساعتوں میں، ساعت دنوں میں، دن مہینوں میں اور ماہ و سال صدیوں میں ڈھلتے جاتے ہیں۔ زمانے کی اس تند و سبک سیر رو میں شخصی اور تہذیبی نقوش ایسے ہوتے ہیں جو تاریخ ہی کا حصہ نہیں بن جاتے بلکہ آفاقی فکر و احساس کی لہروں سے مل کر حیاتِ جاوداں کا درجہ حاصل کر لیتے ہیں۔ مرزا اسداللہ خاں غالبؔ کی شخصیت اور ان کا فن بھی انھی ادبی و تہذیبی نقوش میں شامل ہیں۔ غالبؔ کو رحلت کیے اب ایک سو تینتیس چونتیس سال ہو گئے ہیں۔ زمانے کی تقویم بیکراں میں تو سو سوا سو سال کا عرصہ ایک لمحے ہی کی حیثیت رکھتا ہے مگر افراد کی حیات و ممات میں اتنا عرصہ بھی فیصلہ کُن ہوتا ہے۔ غالبؔ کے زمانے کی بہت سی سربر آوردہ ہستیاں آج قصۂ پارینہ کی نذر ہو چکی ہیں مگر اپنے زمانے میں ناقدری کا شکار غالبؔ پہلے سے زیادہ زندہ و تابندہ ہے اور اس کے فکر و فن کا مطالعہ مختلف جہتوں سے ہو رہا ہے۔

کائنات کی ہر شے متحرک، رواں دواں، عروج و زوال کی بلندیوں اور پستیوں سے دوچار ہے۔ غالبؔ کو اس انقلابِ دوراں کا پورا احساس تھا:

ہیں زوال آمادہ اجزا آفرینش کے تمام
مہرِ گردوں ہے چراغِ رہگذارِ باد یاں

افراد اور اقوام سب اس آئینۂ ایام میں اپنی اپنی جلوہ گری دکھا کر اپنی منزل مراد کو جا لیتے ہیں۔ فکرِ فردا سے بے پروا افراد اور تاریخ امم سے بے خبر اقوام اپنے انجام کو جلد پہنچ جاتے ہیں۔ مگر باشعور افراد اور عاقبت اندیش اقوام عیشِ امروز میں غرق ہونے کی بجائے اپنے دوش و فردا کا محاسبہ کرتی اور زندہ رہتی ہیں۔ غالبؔ کے ہاں ترکانہ ورثے میں عیشِ امروز کا احساس

بہ شدت موجود ہے مگر وہ اس میں اپنے شعور و آگہی کی بدولت ڈوبتے نہیں۔ ان کی بے پناہ حس اور اک اپنے گردو پیش کے بدلتے ہوئے حالات کا عقلی تجزیہ قدم قدم پر کرتی ہے اور انہیں ردّ و قبول کی راہیں سُجھاتی رہتی ہے۔

زمانے کی تندو سبک سیر رو میں تنکوں کی طرح بہتے ہوئے ذکی الحس افراد کی طرح غالب کو بھی اپنے نیست و نابود ہو جانے کا احساس ستاتا ہوگا، اور وہ مہذب انسان کے اس مقسوم پر خالقِ حقیقی سے شکایت آمیز اور درد انگیز لہجے میں یہ کہنے پر مجبور ہوئے ہوں گے:

یا رب زمانہ مجھ کو مٹاتا ہے کس لیے
لوحِ جہاں پہ حرفِ مکرر نہیں ہوں میں

حیاتِ غالب کی گرہیں کھولنے والوں نے ان کی زندگی کے ایک ایک گوشے کو بے نقاب کرنے کی سعیِ بلیغ کی ہے۔ مگر مغل عہد کی عالیشان عمارتوں کی طرح غالب کی ہشت پہلو شخصیت بہت کچھ بے نقاب ہونے کے بعد بھی اپنے کئی پہلوؤں اور گوشوں اور پرتوں کو پردہ راز میں رکھے ہوئے ہے اور شاید اسی اَسرار و اخفا ہی میں اس کی دلکشی پنہاں ہے۔ جس شخص کی آرزوؤں اور خواہشوں کی وسعت، سیرابی اور پھر بھی تشنہ لبی کا یہ عالم ہو کہ:

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

اور پھر جس شخص کا تصورِ حسن و جمال بھی انتہا بے کراں ہو کہ:

سب کہاں، کچھ لالہ وگُل میں نمایاں ہوگئیں
خاک میں، کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہوگئیں

اور جو اپنے احساسِ گناہ کے سلسلے میں ناکردہ گناہوں کی حسرت و خلش کے لیے بھی خالقِ حقیقی سے دادخواہ ہے:

ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد
یا رب اگر اِن کردہ گناہوں کی سزا ہے

ایسے شخص کے کردار اور قول و فعل کو بندھے ٹکے روایتی پیمانوں سے کیوں کر جانچا جاسکتا

ہے؟ ایسا شخص مقلد نہیں ہوتا، مجتہد ہوتا ہے۔ وہ روایت سے بغاوت تو نہیں کرتا مگر اپنی وسیع جولان گاہِ خیال اور اپنی بے پناہ قوتِ تخلیق سے وہ کہنہ روایات کا رخ نئی سمت کی طرف موڑ دینے پر قادر ہوتا ہے۔ غالب، فارسی اور اردو کی ہزار سالہ شعری وتہذیبی روایت میں ایک ایسا ہی مجتہد ہے جس نے اقلیمِ عشق، اقلیمِ فکر اور اقلیمِ فن کی محکم روایات سے بھرپور استفادہ کیا مگر وہ ان کا اسیر نہیں ہوا۔ اس نے بندھے ٹکے اصولوں، ضابطوں اور نظریوں سے انحراف بھی کیا اور ایک حقیقی رومان پسند مفکر، شاعر اور ادیب کی طرح وہ نئے انفس و آفاق کی جستجو میں مستانہ وار رہ وادیِ خیال طے کرتا چلا گیا:

ہے پرے سرحدِ ادراک سے اپنا مسجود
قبلے کو اہلِ نظر قبلہ نما کہتے ہیں

-☆-

مستانہ طے کروں ہوں رہِ وادیِ خیال
تا، بازگشت سے نہ رہے مدعا مجھے

اقلیمِ عشق میں غالب کی انا (خودی) روایت کے طلسم کو متعدد پہلوؤں سے توڑتی اور نئے ممکنات کی جستجو اور نئے رویوں کا اظہار کرتی نظر آتی ہے۔ اس کی واضح مثال اُن کے ہاں فارسی، اردو کی شعری روایت کے مسلّمہ ابطال (ہیروز) کے تذکرے کے سلسلے میں ملتی ہے جن کا ذکر وہ اس طور پر کرتے ہیں جس میں کچھ نہ کچھ ان مشاہیر کی تحقیر اور بے وقعتی کا پہلو نکلتا ہو۔ یہ بُت شکنی نئی جہتوں کی دریافت اور اپنی عاشقانہ عظمت کے اظہار کی ایک انوکھی صورت ہے۔ قیس، کوہکن، منصور وغیرہ اقلیمِ عشق کے ناموروں کا تذکرہ غالب کے شعروں میں جہاں بھی آیا ہے وہاں کم وبیش یہی انداز ملتا ہے، یعنی اپنی برتری اور ان مشاہیر عشاق کی کمتری کا پہلو۔ چند شعروں میں یہ صورت احوال ملاحظہ کیجیے:

قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے دریا لیکن
ہم کو تقلیدِ تنک ظرفیِ منصور نہیں

عشق و مُزدوریِ عِشرت گہہِ خسرو، کیا خوب
ہم کو تسلیم نِکو نامیِ فرہاد نہیں

تیشے بغیر مر نہ سکا کوہکن، اسدؔ!
سر گشتۂ خمارِ رُسوم و قیود تھا

قد و گیسو میں قیس و کوہکن کی آزمائش ہے
جہاں ہم ہیں، وہاں دار و رسن کی آزمائش ہے

دیکھیے پہلے تینوں شعروں میں منصور اور فرہاد کی عظمت کو چیلنج کرتے ہوئے اُن کی تحقیر کا کوئی نہ کوئی پہلو نکالا گیا ہے اور آخری شعر میں تو واضح طور پر قیس و کوہکن کو عام قسم کے عشاق قرار دیتے ہوئے جانبازی کے نقطۂ نظر سے اپنی برتری کا دعویٰ کر دیا گیا ہے۔ انسانی فکر و عمل کی امکانی وسعتوں کے لحاظ سے یہ روایت شکنی قابلِ قدر کہی جا سکتی ہے۔

مگر غالب کے روایت پرست معاصرین اُس کے فکری و فنی اجتہاد کو قدر کی نگاہوں سے نہ دیکھ سکے۔ بعض معاصرین نے تو انہیں بے سر و پا اور مُہمل گو تک بھی کہہ ڈالا۔ غالب اپنے زمانے کی اس ناقدری کے شاکی تھے۔ وہ جہاں مُہمل گوئی کے اس الزام کے جواب میں بڑی بے نیازی سے یہ منفی انداز اختیار کرتے ہیں:

نہ ستائش کی تمنا، نہ صلے کی پروا
گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی

وہاں مُثبت انداز میں اپنے نکتہ چینوں کی لفظی مُوشگافیوں کا فنِ شعر اور ذوقِ سُخن کے اس حقیقی نظریے کے حوالے سے مُسکت جواب بھی دیتے ہیں:

حُسن فروغِ شمعِ سُخن دُور ہے اسدؔ
پہلے دلِ گداختہ پیدا کرے کوئی

یہ تو خیر غالب کے بعض روایت پرست معاصرین کی تنگدلی اور کوتاہ نظری تھی کہ وہ اُن کے شعری اجتہاد کا کماحقہٗ اعتراف نہ کر سکے، ورنہ غالب کو غالب بنانے میں اُس عہد کا بھی خاصا حصّہ ہے جو دو تہذیبوں کے تصادم کا دلخراش منظر پیش کر رہا تھا۔ ایک طرف قدیم تہذیب کے

خوش نما کاخ وایواں تھے جو برِ صغیر میں صدیوں کے تہذیبی عمل اور اسلامی اثرات کا نتیجہ تھے، مگر گزشتہ ایک صدی میں زوال و انحطاط کی آندھیوں نے انہیں بیخ و بُن سے ہلا دیا تھا۔ دوسری طرف انگریزی راج کے ساتھ مغربی تہذیب اپنی جدید ٹیکنالوجی اور استعماری استحصال کے جلو میں فاتحانہ کرّ و فر سے آرہی تھی۔ غالب کے دل میں قدیم تہذیب کے رنگا رنگ ہنگامے جنت نگاہ و فردوس گوش کا منظر بن کر بسے ہوئے تھے، مگر اُن کا عقلی رویّہ اُنہیں نئے دور کی ترقیات اور تبدیلیوں کو خوش آمدید کہنے پر مجبور کررہا تھا۔ دل اور دماغ کی یہ کشمکش ذاتی اور اجتماعی درد و غم سے مل کر غالب کے فکر و ذہن میں ایک پُر تاثیر تہذیبی مرقع بن جاتی ہے جسے بغور دیکھیں تو اس میں اس عہد کی داستانِ دلگداز کے خط و خال ملیں گے جنھیں شاعر کے اشکِ خوں نے رنگین بنایا ہے۔

۱۸۵۷ء کے المیۂ خوں فشاں میں شہرِ دہلی کا ذرّہ ذرّہ، جسے مسلمانوں نے اپنے عہدِ عروج میں ستاروں کی چمک دی تھی، اُن کے لہو کا پیاسا بن جاتا ہے تو غالب کا دل خون ہو جاتا ہے اور یہ لہو اُس کی آنکھوں سے ٹپک کر اس شعر میں ڈھل جاتا ہے:

شہر دہلی کا ذرّہ ذرّہ خاک
تشنۂ خوں ہے ہر مسلماں کا

غالب کو کیا پتہ تھا کہ جور و ستم کی یہ داستان خونچکاں نوّے سال بعد پھر دہلی کے کوچہ و بازار میں دُہرائی جائے گی، اور اُن کا یہی شعر ایک بار پھر اُن کے دیدۂ خونبار کا ترجمان بن جائے گا!

بہر کیف، انیسویں صدی کے نصف اوّل کے نشیب و فراز غالب کی نگاہوں کے سامنے گزرے اور ۱۸۵۷ء کے قلزمِ خوں کے تو وہ خود ایک شناور تھے۔ دلّی کی بربادی اور مسلمانوں کے قتلِ عام اور مسلسل دار و گیر کے بعد بھی وہ اپنی قوم کے تہذیبی مرقد کے نوحہ خواں بن کر ۱۸۶۹ء تک جیتے رہے اور اپنے ہی اس شعر کی تمثیل بنے رہے:

غمِ ہستی کا اسدؔ کس سے ہو جز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

۱۸۵۷ء سے قبل مرزا اسد اللہ خاں غالب کی تخلیقی صلاحیتوں کا اظہار زیادہ تر شاعری میں ہوا، فارسی میں بھی اور اُردو میں بھی۔ غالب کی غزل فکر اور فن کے لحاظ سے اُس حسین و جمیل

تہذیب کا آخری مرقع ہے جو اپنے عہدِ عروج میں تاج محل، جامع مسجد، بادشاہی مسجد اور لال قلعے کی صورت میں ڈھل کر دُنیا کے سامنے آئی اور عجوبۂ روزگار کہلائی۔ غالب کے زمانے میں یہ تہذیب آرزوؤں اور تمناؤں کے خیالی تاج محل ہی پیش کر سکتی تھی۔ حقیقی اور مادی تاج محل، مسجدیں، قلعے اور شالیمار بنانے کے وسائل غالب، بہادر شاہ ظفر اور اُن کی قوم کی دسترس سے باہر ایسٹ انڈیا کمپنی کے قبضے میں جا چکے تھے۔ ''بزمِ آخر'' کا یہ فکر انگیز دَور آرزو اور شکستِ آرزو کی کشاکش سے عبارت تھا، اور مرزا غالب کو قدرت نے اس کے خوش نوا ترجمان کے طور پر قبول کر لیا تھا۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ مغلیہ تہذیب نے دم توڑنے سے قبل اپنی داستانِ عروج وزوال کی فکر انگیز مرقع کشی کے لیے مرزا غالب کو منتخب کر لیا تھا:

نہ گُلِ نغمہ ہوں نہ پردۂ ساز
مَیں ہوں اپنی شکست کی آواز
طبع ہے مشتاقِ لذّت ہائے حسرت کیا کروں
آرزو سے ہے شکستِ آرزو مطلب مجھے

غالب کی ایک مشہور اور بحث طلب قطعہ بند غزل ہے جس کے مقطعے میں وہ کہتے ہیں:

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں
غالب صریرِ خامہ نوائے سروش ہے

بعض لوگوں کے نزدیک یہ غزل واقعہ انقلاب ۱۸۵۷ء سے متاثر ہو کر کہی گئی۔ یہ بات درست نہیں۔ یہ غزل تو اس واقعے سے بہت پہلے کی ہے، لیکن اس کے بھرپور ایمائی انداز میں یہ تہذیبی المیہ (جس کا ڈراپ سین ۱۸۵۷ء کا واقعہ انقلاب تھا) پوری طرح نکھر کر سامنے آ گیا ہے۔ شاعر کی چھٹی، ساتویں اور آٹھویں حِس (وجدان) بعض اوقات اُس سے ایسے ایسے اشعار بھی کہلوا دیتی ہے جو تنہا اس کے شعور یا لاشعور ہی کا حصّہ نہیں ہوتے بلکہ اُن میں اُس کے عہد کی رُوحِ عصر بھی کارفرما ہوتی ہے۔ یہ شعر کسی ایک واقعے سے متعلق نہیں کہا جا سکتا، بلکہ سلسلہ واقعات و حادثات کا فن کارانہ ردِّ عمل معلوم ہوتا ہے:

داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی
اِک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خموش ہے

غور فرمائیے، کیا یہ وہی تہذیبی مجلس نہیں جس کے زندہ ہنگامے ایک ایک کر کے جیبِ خاک سوتے چلے گیے اور بزم آخری شمع فروزاں اور اس کے ساتھ ہی شاعر کا دلِ سوزاں اُس کے جل بجھنے اور مٹ جانے کا فکر انگیز نوحہ خواں بن کر ہمارے سامنے آ رہا ہے:

ایک ہنگامے پہ موقوف ہے گھر کی رونق
نوحۂ غم ہی سہی نغمۂ شادی نہ سہی

۱۸۵۷ء کے انقلاب کے بعد یہی فلسفی غالب اپنے اُردو مکاتیب میں کبھی دلّی کی بہاروں کے لٹنے کا ماتم کرتا ہے، کبھی مسلمانوں کی گزشتہ عظمت وحشمت کا حسرت بھرے انداز میں تذکرہ کرتا ہے۔ کبھی اشکِ غم بہا کر اور کبھی ضبطِ غم کر کے آنسوؤں اور آہوں کو مسکراہٹوں میں بدلنے کی کوشش میں لطیفوں اور نکتہ آفرینیوں کی پھلجڑیاں چھوڑتا ہے، اور اپنا غم غلط کرتا اور احباب کو بھی خوش مذاقی وزندہ دلی سے جینے کا سلیقہ سکھاتا ہے۔ غم والم کے ماحول میں زندہ دلی کا یہ حوصلہ پیدا کرنا غالب جیسے ہی عظیم فن کار کا فیضان ہے۔ ورنہ اہلِ نظر جانتے ہیں کہ غالب کی اس شوخی، بذلہ سنجی اور خوش طبعی کے سوتے بھی دراصل اُس تہذیبی الیے سے پھوٹتے ہیں جس کا وہ زندگی بھر فکر انگیز مرثیہ خواں بنا رہا:

دل لگی کی آرزو بے چین رکھتی ہے ہمیں
ورنہ یاں بے رونقی سودِ چراغِ کشتہ ہے

☆ ☆ ☆

محاسنِ خطوطِ غالب

خطوطِ غالب کے مجموعے

غالب کے موجود اُردو خطوط کی روشنی میں مرزا کی اُردو خطوط نویسی کا آغاز مارچ ۱۸۴۸ء میں ہوا، اور تقریباً دس گیارہ سال بعد (نومبر ۱۸۵۸ء میں) ان خطوط کی طباعت و اشاعت کا مسئلہ پیدا ہوا۔ یہ سوال غالب کے شاگردوں منشی ہرگوپال تفتہ اور شیونرائن آرام نے (غالباً باہمی مشورے سے) اٹھایا۔ ان دونوں حضرات کے خطوط موجود نہیں، لیکن غالب نے انہیں جو جواب دیا (آرام کے نام ۱۸ نومبر ۱۸۵۸ء کو اور تفتہ کے نام دو دن بعد ۲۰ نومبر کو) اُس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ غالب اس سوال پر سخت کبیدہ خاطر ہوئے اور انہوں نے اس کا درشتی سے جواب دیا۔ اس طرح یہ مسئلہ پیدا ہوتے ہی دب گیا۔ تاہم اس کی امکانی صورت ضرور سامنے آ گئی کہ غالب کے اُردو خطوط میں احباب گہری دلچسپی لے رہے ہیں اور کسی نہ کسی دن یہ نجی تحریریں منظرِ عام پر آ کر رہیں گی۔

دو تین سال گزرنے کے بعد ۱۸۶۱ء میں عبدالغفور سرور مارہروی نے منشی محمد ممتاز علی خاں کے مشورے سے اپنے اور صاحب عالم دشاہ عالم کے نام خطوط (جو زیادہ تر علمی نوعیت کے تھے) کی طباعت کا ارادہ کیا اور ۳۱ خطوط کا مجموعہ ''مہرِ غالب'' کے عنوان سے مرتب کیا۔ لیکن ۱۸۶۳ء تک یہ مجموعہ مسودے کی صورت میں پڑا تھا۔ سرور نے اس کے دیباچے میں لکھا:

''اربابِ علوم کو معلوم ہو کہ میں انکسار ظہور، عبدالغفور متخلص بہ سرور مارہروی بدو شعور سے اہلِ سخن کا طالب اور صاحب کمال کا خواہاں تھا۔ جب کلام بلاغت نظام رشکِ صائب، فخرِ طالب، جناب اسد اللہ خاں غالب کا دیکھا، دل کو بھایا، یکتا پایا۔ ترسیل مراسلات میں قدم بڑھایا، ہر کتابت کا جواب آیا۔ ----- جو نامہ کہ بنام میرے بعبارت اُردو تحریر کیا، مکتوب سادہ رویوں سے دلربا تر، اور ہر سطر اُس کی سلسلہ مویوں سے

تاب فرسا زیادہ ہے۔ جس آنکھ نے دیکھا، وہ بینا ہے۔ جس کان نے سنا، وہ شنوا ہے۔ پس تمہا حملہ ذہنوا اور آپ ہی آپ مزہ اُٹھانا خلاف انصاف جانا۔ دل مائل تمام بشہرت عام ہوا، اور ہنوز یہ قصد ناتمام تھا کہ بحسن اتفاق فخر زماں، وحید وروراں، جناب ممتاز علی خاں صاحب، متوطن میرٹھ۔۔۔رونق افزاے مارہرہ ہوے۔۔۔ایک روز محفل ممدوح میں ذکر ہمہ دانی وشیوہ بیانیٔ جناب اُستاذی ومخدومی درمیان آیا۔ ارشاد کیا کہ کلام میرزا صاحب نسیم جانفزا اور شمیم دلکشا ہے۔ فارسی کا کیا کہنا۔ اُردو بھی یکتا ہے۔ نظم ونثر فارسی تو محلّی بحلیہ ءانطباع ہوا، لیکن نثر اُردو زیورطبع سے عاری رہا۔ اگر وہ خطوط کہ بنام تمہارے آئے اور تم نے سنائے ہیں، جمع کرو، تو میں اس کے انطباع کا بیڑا اٹھاتا ہوں۔ اس تقریر سے نسیم تاثیر نے غنچۂ دل کھلایا۔ منشاے خاطر ظہور میں آیا۔ وہ مکتوب کہ بنام میرے آئے تھے، ترتیب دیے۔ گویا جواہر بے بہا کان قلمدان سے نکال کر کشتی اوراق میں جمع کیے۔ چونکہ محبت جناب غالب میرے حال پر بہت غالب ہے، لہٰذا نام اس انشا کا 'مہر غالب' (بکسر میم) مناسب ہے، سال ختم تالیف بھی اس نام سے مطابق پایا۔"[۱]

عُودِ ہندی:

''مہر غالب'' کی طباعت کا مرحلہ شروع نہ ہوا تھا۔ منشی ممتاز علی خاں کو خیال آیا کہ اگر اس میں کچھ اور احباب کے خطوط بھی فراہم ہو جائیں تو مناسب ہے۔ اس دوران میں منشی غلام غوث بے خبر نے بھی غالب کے خطوط کا مجموعہ مرتب کرنا شروع کر دیا تھا۔ اب غالب بھی اس میں دلچسپی لینے لگے، اور انہیں تشویق ہوئی کہ یہ مجموعہ جلد از جلد چھپ جائے۔ اس کا اظہار مختلف خطوط میں ہونے لگا:

''ہاں حضرت، کہیے ممتاز علی خاں کی سعی بھی مشکور ہوگی؟ وہ مجموعۂ اردو چھپا یا چُھپا ہی رہے گا؟ احباب اس کے طالب ہیں، بلکہ بعض نے طلب کو بسر حد تقاضا پہنچا دیا ہے''۔

[خط بنام غلام غوث بیخبر، ۷ مارچ ۱۸۶۴ء، خطوط غالب، از مہر صفحہ ۳۳۸]

''پیر و مرشد'' کوئی صاحب ڈپٹی کلکٹر ہیں کلکتہ میں، مولوی عبدالغفور اُن کا نام اور نساخ اُن کا تخلّص ہے۔ میری اُن کی ملاقات نہیں۔ انہوں نے اپنا دیوان چھاپے کا موسوم

---

[۱] عود ہندی، ۶۵

بہ "دفتر بے مثال" مجھ کو بھیجا۔ اس کی رسید میں یہ خط میں نے اُن کو لکھا۔ چونکہ یہ خط مجموعۂ نثر اُردو کے لائق ہے، آپ کے پاس ارسال کرتا ہوں۔ اور ہاں حضرت وہ مجموعہ چھپے گا بالفتح۔ یا چھپے گا بالضم؟ چھپ چکا ہو تو حق تصنیف کی جتنی جلدیں منشی ممتاز علی خاں صاحب کی ہمت اقتضا کرے فقیر کو بھیجے۔ والسلام۔

[ایضاً ۱۸۶۴ء، خطوط غالب ص ۳۴۰]

"اجی حضرت، یہ منشی ممتاز علی خاں کیا کر رہے ہیں؟ رقعے جمع کیے اور نہ چھپوائے۔ فی الحال پنجاب احاطہ میں ان کی بڑی خواہش ہے۔ جانتا ہوں کہ وہ آپ کو کہاں ملیں گے جو آپ ان سے کہیں، مگر یہ حضرت کے اختیار میں ہے کہ جتنے میرے خطوط آپ کو پہنچے ہیں وہ سب یا اُن سب کی نقل بطریق پارسل آپ مجھ کو بھیج دیں۔ جی یوں چاہتا ہے کہ اس خط کا جواب وہی پارسل ہو"۔

[ایضاً۔ خطوط غالب ص ۳۵۲، ۳۵۳]

آخر غالب کا یہ مجموعۂ خطوط "عود ہندی" (بشمول مہر غالب) غالب کی وفات سے تقریباً چار ماہ پیشتر اکتوبر ۱۸۶۸ء میں مطبع مجتبائی میرٹھ سے چھپا۔ ۱۸۸ صفحات کے اس مجموعے کے شروع میں دو دیباچے (عرض ناشر و دیباچۂ سرور) ہیں۔ اس کے بعد فصل اول "مہر غالب"، فصل دوم "عود ہندی"۔ آخر میں خاتمہ (از قلق میرٹھی)، دو تقریظیں اور تین دیباچے (جو غالب نے دوسروں کی کتابوں پر تحریر کیے)۔ یہ مجموعہ بہت غلط سلط چھپا۔ غالباً کتابت کسی اناڑی کاتب نے کی۔ اس مجموعے کے خطوط کی تفصیل یہ ہے:

(فصل اوّل) سرور ۲۶، صاحب عالم ۳، شاہ عالم ۲ (فصل دوم) شفق ۲۰، مرزا ابو یوسف عزیز ۲، مجروح ۳۱، میر سرفراز حسین ۱، علائی ۱، تفتہ ۱، مہر ۱۸، بے خبر ۲۵، نساخ ۱، شیفتہ ۱، رعنا مراد آبادی ۱، مرزا رحیم بیگ ۱، شاکر ۱۰، جنون بریلوی ۱۵، عزیز الدین ۱، سید محمد عباس ۱، منشی غلام بسم اللہ ۱، ایک خط ظہیر الدین خاں کی طرف سے اُن کے چچا کے نام۔ ایک خط بے خبر کا مرزا غالب کے نام۔

اردوے معلّٰی (حصہ اوّل):

جب مولوی ممتاز علی خاں کے جمع کردہ خطوط کی طباعت میں تاخیر ہوئی اور احباب کی ''طلب سرحد تقاضا'' تک پہنچ گئی تو دہلی کے احباب کو بھی خطوطِ غالب کے جمع کرنے اور شائع کرنے کا خیال پیدا ہوا۔ اکمل المطابع نے طباعت کا بیڑا اٹھایا۔ اس مجموعے کی ترتیب وطباعت میں غالب خود دلچسپی لے رہے تھے اور خطوط کی جمع آوری کے لیے احباب کو لکھ رہے تھے۔ بے خبر کے نام اس قسم کے ایک خط کا حوالہ سطور بالا میں آ چکا ہے۔ علائی کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

''مقصود ان سطور کی تحریر سے یہ ہے کہ مطبع ''اکمل المطابع'' میں چند احباب میرے مسوّدات اردو کے جمع کرنے پر اور اس کے چھپوانے پر آمادہ ہوئے ہیں۔ مجھ سے مسوّدات مانگتے ہیں اور اطراف وجوانب سے بھی فراہم کیے ہیں۔ میں مسودہ نہیں رکھتا۔ جو لکھا، وہ جہاں بھیجنا ہوا، وہاں بھیج دیا۔ یقین ہے کہ خط میرے تمہارے پاس بہت ہونگے۔ اگر ان کا ایک پارسل بنا کر بسبیل ڈاک بھیج دو گے یا آج کل میں کوئی ادھر آنے والا ہو اور اُس کو دو گے تو موجب میری خوشی کا ہوگا اور میں ایسا جانتا ہوں کہ اس کے چھاپے جانے سے تم بھی خوش ہو گے''۔

[۱۸۶۳ء، خطوط غالب، صفحہ ۹۲]

غالب کے خطوط کا یہ مجموعہ اردوے معلّٰی (حصہ اول) اکمل المطابع دہلی میں بہ حسن اہتمام سید فخر الدین ۲۱ ماہ ذیقعدہ ۱۲۸۵ ہجری مطابق ۶ مارچ ۱۸۶۹ء روز مبارک جمعہ کو بساعت سعید و آوان حمید چھپ کر تیار ہو گیا۔ غالب کا انتقال ۲ ذیقعدہ ۱۲۸۵ھ مطابق ۱۵ فروری ۱۸۶۹ء کو ہوا۔ یعنی یہ مجموعہ جو مرزا غالب کی زیر نگرانی دہلی میں زیر طبع رہا' اُن کی وفات کے انیسویں روز بعد زیورِ طبع سے آراستہ ہو کر منظرِ عام پر آیا۔ یہ مجموعہ ۴۶۳ صفحات پر مشتمل ہے، جس میں آغاز' خاتمہ و غلط نامہ شامل ہیں۔ سرورق سبز، پیلا مختلف رنگ کے کاغذ پر چھاپا گیا ہے۔ سرورق کی پیشانی پر غالب کا یہ شعر درج ہے:

جو یہ کہے کہ ریختہ کیونکہ ہو رشکِ فارسی
گفتۂ غالب ایک بار پڑھ کے اوسے سنا کہ یوں

اس کے بعد عنوان کتاب ''اردوے معلّٰی'' (حصہ اول)، اوراس کے نیچے یہ عبارت ہے:

''یعنی رقعات اردوے نجم الدولہ دبیر الملک اسد اللہ خان بہادر نظام جنگ المتخلص بہ غالب، جوتعلیم اطفال کے لیے دستور العمل ہے''۔

اردوے معلّٰی کے شروع میں میر مہدی مجروح کی تقریظ ہے۔ خاتمۂ کتاب میرزا قربان علی بیگ خاں سالک نے تحریر کیا ہے۔ تعداد خطوط ۲۰۷ ہے جن کی تفصیل یہ ہے:

نواب میر غلام بابا خاں ۱۰ا۔ خداداد سیاح ۲۹۔ منشی حبیب اللہ خاں ذکا ۱۰ا۔ منشی ہر گوپال تفتہ ۸۹۔ شہزادہ بشیر الدین ۳۔ سید بدر الدین فقیر ۵۔ چودہری عبدالغفور سرور ۱۶۔ میر سرفراز حسین ۲۔ میر مہدی حسین مجروح ۴۳۔ شاہ عالم ۲۔ صاحب عالم ۲۔ عبدالغفور نساخ ۱۔ عزیز ا۔ قاضی عبدالجمیل جنون بریلوی ۱۱۔ رعنا مراد آبادی ۲۔ عبدالرزاق شاکر ۲۔ مولوی عزیز الدین ا۔ مفتی سید محمد عباس ا۔ حکیم غلام نجف خاں ۲۳۔ حکیم ظہیر الدین احمد خاں ا۔ (حکیم ظہیر الدین خاں بنام نجم الدین حیدرا خط[1])۔ نواب میر ابراہیم علی خاں وفا ۵۔ مولوی احمد حسن صاحب قنوجی ۲۔ حکیم سید احمد حسن مودودی ۱۱۔ تفضل حسین خاں ا۔ مرزا حاتم علی مہر ۱۸۔ منشی نبی بخش مرحوم ۲۔ منشی عبداللطیف ا۔ خواجہ غلام غوث بےخبر ۱۴۔ نواب ضیا الدین احمد خان ا۔ مرزا شہاب الدین احمد خاں ۷۔ نواب انور الدولہ سعد الدین خاں شفق ۱۹۔ میر افضل علی عرف میرن صاحب ۳۔ مرزا قربان علی بیگ سالک ۲۔ مرزا شمشاد علی بیگ رضوان ۲۔ مرزا باقر علی خاں کامل ۲۔ ذوالفقار الدین حیدر ۴۔ یوسف مرزا ۱۲۔ منشی شیو نرائن آرام ۳۳۔ بابو ہرگوبند سہاے ۲۔ نواب امین الدین احمد خاں ۶۔ مرزا علاؤالدین احمد خاں علائی ۵۶۔ مرزا امیر الدین احمد خاں ا۔ میر احمد حسین میکش ۲۔ حکیم غلام مرتضٰی ا۔ حکیم غلام رضا خاں ا۔ ماسٹر پیارے لال آشوب ۳۔ منشی جواہر سنگھ جوہر ۲۔ منشی ہیرا سنگھ ا۔ منشی بہاری لال مشتاق ۲۔

---

(۱) یہ خط غالب نے ظہیر الدین کی طرف سے لکھا تھا۔ اس میں قوافی کا التزام قابل ذکر ہے۔

اردوے معلّٰی (حصہ دوم)

اُردوے معلّٰی حصہ اول، جس میں "صاف صاف عبارت کے خط تحریر کیے، تا طلباے مدرسہ فائدہ اُٹھائیں، دوسرے حصے میں مطالب مشکلہ کی تحریر اور تقریظ وغیرہ لکھی" (اردوے معلّٰی، صفحہ ۵)، ۱۸۶۹ء میں چھپ گئی لیکن اس کے دوسرے حصے کی طباعت نہ ہو سکی۔ ۱۸۹۹ء میں مولانا الطاف حسین حالی نے مطبع مجتبائی دہلی سے اس حصے کو بھی چھپوا دیا۔ مولوی عبدالاحد مالک مطبع مجتبائی کے بقول:

"اس حصے میں خاص کردہ رقعات ہیں جن میں انہوں (غالب) نے لوگوں کو اصلاحیں دی ہیں، یا شاعری کے متعلق کوئی ہدایت کی ہے، یا کوئی نکتہ بتایا ہے، اور بعض کتابوں کے دیباچے اور ریویو بھی ہیں"۔

اردوے معلّٰی (حصہ دوم) مطبوعہ مجتبائی ۵۶ صفحات پر مشتمل ہے۔ شروع میں ۷ کتابوں پر دیباچے اور تقریظیں ہیں۔ اس کے بعد ۵۳ خطوط ہیں جن کی تفصیل یہ ہے:

منشی ہرگوپال تفتہ ۳۴، پیارے لال آشوب ۱، حبیب اللہ ذکا ۵، میاں خداداد سیاح ۵، شہزادہ بشیر الدین ۲، کیول رام ہشیار ۱، مولوی کرامت علی ۱، منشی جواہر سنگھ جوہر ۱، منشی ہیرا سنگھ ۱، میر مہدی مجروح ۲۔

غالب کے ان مجموعہ ہائے خطوط کی طباعت کے بعد خطوط غالب کی دریافت و طباعت کا سلسلہ رسائل میں بھی جاری ہو گیا۔ مولانا حسرت موہانی کے رسالے "اُردوے معلّٰی" دسمبر ۱۹۰۷ء کے شمارے میں مولوی علی اصغر بلگرامی کے نام ۲۲، شیخ لطیف احمد بلگرامی کے نام ۱) شائع کیے۔[1] شیخ مبارک علی نے مطبع کریمی لاہور سے ۱۹۲۳ء میں اُردوے معلّٰی حصہ اول و دوم (یکجا) مع ضمیمہ مذکور بالا خطوط شائع کیا۔

مکاتیب غالب:

۱۹۳۷ء میں مولوی امتیاز علی خاں عرشی ناظم کتب خانہ رامپور نے مرزا غالب کے اُن

---

(۱) بحوالہ مکاتیب غالب (دیباچہ عرشی)، صفحہ ۲۵۳

خطوط کا مجموعہ'' مکاتیب غالب'' کے نام سے شائع کردیا جو غالب نے نوابانِ رامپور (نواب یوسف علی خاں اور نواب کلب علی خاں) اور وابستگان دربار کو لکھے تھے۔اس مجموعے میں صرف وہ خطوط مرتب کیے گئے ہیں جو دارالانشا میں محفوظ تھے۔ ۲

'' مکاتیب غالب'' کے خطوط کی تعداد ۱۲۹ ہے جن کی تفصیل یہ ہے:

فردوس مکاں نواب یوسف علی خاں ۴۳، خلد آشیاں نواب کلب علی خاں ۳۷، صاحبزادہ سید زین العابدین خاں ۲، صاحبزادہ سید عباس علی خاں بیتاب ۲، منشی سیلچند ۷، خلیفہ احمد علی احمد ۱، مولوی محمد حسین خاں ۱۔

نادرات غالب:

منشی نبی بخش حقیر سے مرزا غالب کے بہت گہرے اور قلبی مراسم تھے۔ اُردوے معلّٰی میں حقیر کے نام غالب کے صرف دو خطوط شامل تھے۔ بقیہ خطوط کا کچھ پتہ نہ تھا۔ یہ خطوط آفاق حسین آفاق دہلوی کو (جو میرن صاحب کے نواسے ہیں) ترکے میں ملے۔ انہوں نے خطوط کا یہ مجموعہ'' نادرات غالب'' کے نام سے ۱۹۴۹ء میں مشہور پریس کراچی سے شائع کردیا۔ اس مجموعے میں ۲۷ خطوط منشی نبی بخش حقیر کے نام، اور ۲ خطوط (نمبر ۸ و ۳۷) حقیر کے فرزند منشی عبداللطیف کے نام ہیں۔ خط نمبر ۲، ۳۷، ۴۷ اُردوے معلّٰی میں بھی شامل ہیں۔'' نادرات غالب'' کے یہ خطوط ۱۸۴۸ء اور ۱۸۵۹ء کے دوران لکھے گئے۔ پہلا خط فارسی میں ہے اور پنج آہنگ میں شامل ہے۔ دوسرا خط اردو میں ہے اور ۹ مارچ ۱۸۴۸ء کا محررہ ہے، یعنی غالب کے موجود اردو خطوط میں یہ پہلا اُردو خط ہے۔ حقیر کے نام غالب کے ان خطوط کا یہ مجموعہ حیات غالب کا ایک اہم مآخذ ہے۔ مرتب نے اس مجموعے پر حواشی لکھ کر اسے قابل قدر بنادیا ہے۔

نادر خطوط غالب:

رسا لکھنوی نے ۱۲۷ اُردو خطوط کا مجموعہ پیش کیا جو کرامت حسین ہمدانی، صفیر بلگرامی اور صوفی منیری کے نام ہیں۔ محققین کے نزدیک اس مجموعے کا وجود محل نظر ہے۔

---

(۲) ایضاً، صفحہ ۲۵۳

خطوط غالب (از مہیش پرشاد):

منشی مہیش پرشاد پروفیسر بنارس یونیورسٹی نے خطوط غالب کی از سرِ نو ترتیب و تصحیح کا بیڑا اٹھایا اور کچھ غیر مطبوعہ خطوط بھی شامل کیے۔ ان خطوط کی پہلی جلد ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد نے ۱۹۴۱ء میں شائع کی۔ خطوط غالب کے اس مجموعے کو مزید اضافوں کے ساتھ مالک رام نے ۱۹۶۲ء میں چھپوایا۔

خطوط غالب (از غلام رسول مہر):

مولانا غلام رسول مہر نے اردوئے معلّٰی اور عودِ ہندی کی ترتیب توڑ کر اور غالب کے متفرق خطوط کو یکجا کر کے (ماسوا دو مجموعوں مکاتیب غالب و نادرات غالب) اس ضخیم مجموعے میں پیش کیا ہے۔ مہر صاحب نے مکتوب الیہم کے حالات، تاریخوں کی تصحیح و اندراج اور بعض خطوط کے حواشی لکھ کر اور خطوط کو از سرِ نو تاریخ وار ترتیب دے کر پیش کیا۔ اس لحاظ سے یہ مجموعہ خطوط غالب زیادہ قابل قدر اور غالب کی اردو نثر کا مطالعہ کرنے والوں کے لیے مفید ہے [ہم نے محاسن خطوط غالب میں دیگر مجموعوں کے علاوہ اس مجموعہ ''خطوط غالب'' سے خاص طور پر استفادہ کیا ہے اور حواشی میں زیادہ تر اسی مجموعے کے حوالے درج کیے ہیں]۔

غالب کی اُردو نثر

مرزا اسد اللہ خاں غالب نے اپنی جدت پسند طبیعت اور نکتہ رس ذہن کی بدولت اُردو نثر کے قالب میں زندگی کی جونئی روح پھونکی، اس کی قدر و قیمت کا صحیح اندازہ تبھی ممکن ہے جب ہمیں یہ معلوم ہو کہ غالب سے قبل اُردو نثر ارتقا کی کن منزلوں کو طے کر چکی تھی اور اسالیب بیان کے اعتبار سے کس مقام تک پہنچ چکی تھی۔ لہٰذا غالب کی اردو نثر کا جائزہ لینے سے پہلے ہم اجمال کے ساتھ غالب سے پہلے کی نثر پر ایک نظر ڈالتے ہیں۔

اُردو نثر کا باقاعدہ آغاز اگرچہ دکن میں بہمنی عہد سے ہوا اور قطب شاہی عہد میں اردو نثر کا ایک عظیم ادبی کارنامہ ''سب رس'' (از ملا وجہی) تخلیق ہوا، لیکن اردو نثر کے ان دکھنی نمونوں سے شمالی ہند والے تقریباً انیسویں صدی کے آخر تک بے خبر تھے۔ اس لیے اگر ''کربل کتھا'' کو اس کے مؤلف کے دعوے کی روشنی میں ایک عرصے تک اردو کی پہلی نثری تالیف کہا جاتا رہا تو یہ کوئی عجیب بات نہیں۔ ابتدائے عہد محمد شاہی میں شمال والے دکھن کی شعری روایت سے تو کسی حد تک باخبر تھے اور ولی دکھنی کے پُر تاثیر کلام کے زیرِ اثر انہوں نے اردو میں تخلیق شعری کو ایک تحریک کی صورت بھی دی، لیکن نثر کے معاملے میں اس قسم کے اثرات کی کوئی نشاندہی ہمیں نہیں ملتی۔ اس لیے غالب تک اردو نثر کا جو ارتقائی سلسلہ شمالی ہند میں ملتا ہے اس کی ابتدا ''کربل کتھا'' ہی سے ہوئی، جس کے مؤلف کا یہ دعویٰ اس اعتبار سے قابل لحاظ ہے:

> ''پیش ازیں کوئی اس صنعت کا نہیں ہوا مخترع اور اب تک ترجمۂ فارسی بہ عبارت ہندی نہیں ہوئے مستمع[۱]''

کربل کتھا جن حالات اور تقاضوں کے تحت لکھی گئی، اُن کا ذکر فضلی نے اپنے دیباچے

---

(۱) کربل کتھا، مرتبہ مالک رام، مختار الدین احمد، ص ۳۸۔

میں کیا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ کربل کتھا کی تالیف کسی ادبی یا علمی نقطۂ نظر سے نہیں بلکہ عوامی تقاضے کے تحت ہوئی۔ یہ عوامی تقاضا تاریخی لحاظ سے قابلِ ذکر ہے۔ کربل کتھا کی تالیف ۱۱۴۵ھ میں اور اس پر نظر ثانی ۱۱۶۱ھ میں ہوئی۔ یہ محمد شاہی دور تھا۔ اس دور میں اردو بڑی تیزی سے فارسی کی جگہ لے رہی تھی۔ اردو شاعری کا چرچا عام ہو چکا تھا۔ اردو نثر کی طرف ابھی توجہ نہیں کی گئی تھی۔ علمی اور مجلسی اظہار کی زبان فارسی تھی۔ اس ماحول میں محرم کی مجالس میں کم پڑھے لکھے یا ان پڑھ عوام (خصوصاً عورتوں) کی طرف سے یہ تقاضا ''کہ صد حیف و ہزار افسوس جو ہم کم نصیب عبارت فارسی نہیں سمجھتے اور رونے کے ثواب سے محروم رہتے۔ ایسا کوئی صاحبِ شعور ہووے کہ کسی طرح من وعن ہمیں سمجھاوے اور ہم سے بے سمجھوں کو سمجھا کر رُلاوے''۔ (دیباچۂ کربل کتھا)

کربل کتھا کی زبان اور نثری اسلوب کا مطالعہ کرتے ہوئے ہمیں اس دور کی اُس ادبی اور لسانی تحریک کو بھی مدِنظر رکھنا چاہیے جو ولی کے دیوان کے شمالی ہند میں پہنچنے کے بعد شروع ہوئی۔ مرزا مظہر جانِ جاں اور خان آرزو اس تحریک کے سرپرست تھے۔ اردو زبان کو مرکز سلطنت کے ادبی مذاق کی روشنی میں صاف و شستہ بنانے کا کام اس عہد میں شروع ہوا۔ دتی کے روزمرّے اور محاورے کو ترجیح دی جانے لگی اور دوسرے علاقوں (دکن، برج اور پنجاب) کے اثرات کو ختم کیا جانے لگا۔ اصلاحِ زبان کا یہ عمل جو ۱۱۵۰ھ کے لگ بھگ شروع ہوا، مختلف مرحلوں سے گزرتا ہوا، ناسخ تک پہنچا، جن کی ادبی یا لسانی تحریک سے غالب بھی متاثر تھے۔

کربل کتھا سے لے کر فورٹ ولیم کالج کی نثری کاوشوں تک اسالیبِ بیان کے اعتبار سے ہمیں دو طرز ملتے ہیں۔ ایک طرز تو فارسی کے تتبع میں پُرتکلف نثر کا ہے جس کے اہم نمائندے عطا حسین تحسین مرصع رقم (مؤلف نوطرزِ مرصع) تھے۔ دوسرا طرز سادہ نثر کا ہے جس میں ادائے مطلب کو بنیادی حیثیت دی گئی ہے۔ ''کربل کتھا'' اسی زمرے میں آتی ہے۔ اس کے مؤلف نے جس عوامی ضرورت کے تحت روضۃ الشہدا کے فارسی خلاصے سے یہ کتاب ترجمہ کی، اس کا تقاضا یہی تھا کہ اسے عام فہم بنایا جائے۔ اس لیے اس کتاب کا اُسلوب (دیباچے کو چھوڑ کر) سادہ ہے۔ لیکن اس سادگی میں وہ صفائی اور شستگی ابھی پیدا نہیں ہوئی جو پچاس برس بعد کی تصانیف میں نظر آتی ہے۔ شاعری کے مقابلے میں اردو نثر کا اُسلوب ذرا آہستگی سے آگے بڑھ رہا تھا۔ اس

ارتقائی عمل میں اصلاح زبان کی کوششوں کو بھی مدنظر رکھا جائے تو جس سادہ و سلیس نثر کے نمونے فورٹ ولیم کالج کی نگارشات میں نظر آتے ہیں، وہ دفعتاً پیدا نہیں ہوگئے۔ بلکہ کربل کتھا کے بعد پُرتکلف نثر کے ساتھ ساتھ سادہ نثر بھی لکھی جا رہی تھی۔ شاہ عبدالقادر کا ترجمہ قرآن مجید اور شاہ عالم ثانی کی عجائب القصص سادگی اور عام فہمی کی اس روش کے نمونے ہیں۔ تاہم فورٹ ولیم کالج کی نثری نگارشات کی یہ تاریخی اہمیت نظرانداز نہیں کی جاسکتی کہ اس کالج کے منتظمین نے دیسی منشیوں سے اپنی خاص ضرورت کے تحت سادہ، سلیس اور بول چال کے قریب زبان لکھوا کر اردو کے نثری اُسلوب کو متعین کرنے کی بلیغ کوشش کی۔

فورٹ ولیم کالج میں اردو نثر کا جو کام ہوا، وہ ایک سیاسی تقاضے کے تحت تھا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے مقبوضات کا سلسلہ وسیع سے وسیع تر ہو رہا تھا۔ تاریخ کا فیصلہ واضح طور پر نظر آ رہا تھا۔ انتقالِ اقتدار سے قبل جن دستوری مرحلوں کو طے کرنا ضروری تھا، ان میں زبان کا مسئلہ بنیادی اہمیت کا حامل تھا۔ مغلوں کی دفتری زبان فارسی تھی۔ نئے دفتری نظام کے لیے زبان کی تبدیلی سیاسی لحاظ سے ازبس ضروری تھی۔ فارسی کی جگہ فی الفور انگریزی نہیں لے سکتی تھی۔ انتظامی لحاظ سے بھی اور نفسیاتی اعتبار سے بھی اس موقع پر انگریزی کو لانا مضر تھا۔ اندریں حالات اردو ہی ایک ایسی زبان تھی جس کو ملک میں لینگوا فرینکا کا درجہ حاصل تھا اور اس وقت کی تبدیلی کے لیے یہی زبان موزوں ترتھی۔ چنانچہ یہ تجربہ فورٹ ولیم کالج میں ہوا، اس کے نتائج کچھ عرصہ بعد دفتری زبان کی تبدیلی کی صورت میں ظاہر ہوئے۔ ۱۸۳۲ء میں دفتری زبان اردو ہوگئی۔ اسی زمانے میں اردو اخبار بھی نکلنے لگے۔ مذہبی تبلیغ کے لیے بھی اردو سے کام لیا جانے لگا۔ اگرچہ مستقبل کے دفتری تقاضوں کے لیے ۱۸۳۵ء میں انگریزی زبان ذریعۂ تعلیم بنا دی گئی، تاہم دہلی کالج میں اردو ہی ذریعہ تعلیم رہی اور اس کالج کی تعلیمی و نصابی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے دہلی ورنیکلر ٹرانسلیشن سوسائٹی قائم ہوئی۔ اردو نثر کے فروغ کا یہ نقطۂ ارتقا غالب کی نگاہوں کے سامنے تھا۔

فورٹ ولیم کالج سے دہلی کالج تک اردو نثر کے اس فروغ و ترقی کے ماحول میں ادبی نقطۂ نظر سے جہاں فورٹ ولیم کالج کی روش پر سادہ و سلیس نثر میں داستانی ادب تالیف و ترجمہ ہوا،

وہاں لکھنؤ کا تکلف پسند رجحان بھی داستانوں میں نظر آتا ہے۔ اس رجحان کے نمائندے رجب علی بیگ سرور (مؤلف فسانہ عجائب) تھے جن کی ایک تصنیف[1] پر غالب نے تقریظ لکھی ہے۔ سادگی اور تکلف کے یہ دونوں سلسلے مرزا غالب کی نثر نگاری تک اپنے اپنے حلقوں میں قبول عام کا درجہ رکھتے تھے۔ خصوصاً داستانوں کا رجحان عام ہو رہا تھا۔ داستانیں لکھی بھی جاتی تھیں۔ ان کو پڑھا بھی جاتا تھا اور سنایا بھی جاتا تھا۔ مشاعرے کی طرح داستان گوئی ایک تہذیبی ادارے کا درجہ حاصل کر چکی تھی۔ غالب کو بھی داستانوں سے بڑی دلچسپی تھی۔ شراب کی بوتلیں اور ضخیم داستانیں ان کا دل پسند مشغلہ تھیں۔ فروغِ اردو کے اس ماحول میں غالب بھی بعض ضرورتوں اور مجبوریوں کے تحت اردو نثر (خطوط نگاری) کی طرف مائل ہوئے اور پھر یہی ضرورت یا مجبوری کچھ عرصہ بعد ایک عادت بن کر ان کے لیے راحت و دلچسپی کا ذریعہ بن گئی۔ اس طرح تاریخ نے اردو نثر کو ایک ایسا صاحبِ طرز ادیب دیا جس نے اپنے اندازِ خاص میں اردو نثر کے قالب میں نئی روح پھونکی۔

جہاں تک اسلوب کے خارجی محاسن کا تعلق ہے غالب کے زمانے تک اردو نثر تجربات کی مختلف منزلوں سے گزر چکی تھی۔ اس میں مغلق اور رنگین اسلوب تھا تو سادہ و سلیس اسلوب بھی تھا۔ اس میں لکھنؤ کی پُر تکلف صنعت گری تھی تو دہلی کا روز مرہ اور محاورہ بھی موجود تھا۔ لیکن ان مختلف اسالیب بیان کے اندر جہاں تک کسی شخصیت کی جھلک کا تعلق ہے، وہ اس وقت تک مفقود تھی۔ شخصی اُسلوب، جس میں کسی شخصیت کے دل کی دھڑکنیں، فکر و احساس کی لہریں اور جذب و شوق کے سلسلے سمائے ہوئے ہوتے ہیں، آسانی سے پیدا نہیں ہو جاتا۔ یہ نہ ریاض کا ثمر ہے نہ اتفاق کی بات۔ یہ تو ایک عطیۂ قدرت ہے، جسے مل جائے، مل جائے۔ زبان اپنے ذخیرۂ لفظی سمیت موجود ہوتی ہے۔ صرف ونحو کے قواعد بھی متعین ہو جاتے ہیں۔ لیکن انہی لفظوں اور قاعدوں کے بے ساختہ استعمال میں جب کوئی اہلِ قلم اپنی شخصیت کو بھی سمو دیتا ہے تو شخصی اسلوب ظہور میں آتا ہے۔ یہ مرحلہ اردو نثر میں غالب کی نثر کے ساتھ آیا۔ یہاں سے اردو نثر میں تخلیقی ادب کا سلسلہ شروع ہوتا ہے اور مختلف اصناف ادب کے لیے اسلوب کی بنیاد مہیا ہوتی ہے۔

---

(۱) گلزار سرور۔

اردو نثر میں غالب کا سرمایہ زیادہ تر ان کے خطوط ہیں۔ خطوط کے کچھ مجموعے ان کی زندگی ہی میں چھپنا شروع ہو گئے تھے (عودِ ہندی وفات سے چار ماہ پہلے اور اردوے معلّیٰ حصہ اول وفات کے ایک ماہ بعد طبع وشائع ہوئے)۔ خطوط کے کچھ مجموعے (اردوے معلّیٰ، حصہ دوم، مکاتیب غالب اور نادرات غالب) بہت بعد میں طبع ہوئے۔ خطوط کے علاوہ غالب نے کچھ تقریظیں، دیباچے اور رسالے لکھے ہیں۔ رسائل میں نکات غالب (مطبوعہ ۱۸۶۷ء)، لطائف غیبی (مطبوعہ ۱۸۶۴ء) تیغ تیز (مطبوعہ ۱۸۶۷ء)، نامۂ غالب، سوالات عبدالکریم قابل ذکر ہیں۔ تقریظیں بہادر شاہ ثانی اور رجب علی بیگ سرور کی تالیفات پر اور دیباچے انتخاب غالب، خاش وخماش، دیوان سخن اور قصائد مرزا کلب حسین خاں پر لکھے گئے۔ ان نثری نگارشات کے اسلوب کا جائزہ لینے سے پہلے ان حالات یا مجبوریوں کا ذکر ضروری معلوم ہوتا ہے جن کے تحت غالب نے فارسی کو چھوڑ کر اردو میں تحریریں لکھنی شروع کیں۔

اردو نثر نگاری سے پہلے غالب ایک مدت تک فارسی میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے رہے تھے۔ [اُن کے فارسی خطوط ''پنج آہنگ'' کے مجموعے میں چھپے] ہر چند کہ اس زمانے میں اردو کا حلقۂ اثر خاصہ وسیع ہو چکا تھا لیکن اہلِ فضل وکمال ابھی تک اپنی علمی کاوشوں کے اظہار کے لیے فارسی کا دامن تھامے ہوئے تھے۔ پھر غالب کہ جنہیں اپنی فارسی دانی پر بڑا ناز تھا، اس راہ و روش کو کیونکر چھوڑ سکتے تھے۔ فارسی میں علمی وادبی اظہار بالعموم سیدھا سادہ اور بے تکلفانہ نہیں تھا۔ فارسی یہاں کے لوگوں کی فطری زبان بھی نہیں تھی کہ جسے بے ساختہ طور پر لکھا جا سکتا۔ اس لیے ظاہر ہے کہ فارسی میں انشا نگاری کے لیے محنت وکاوش کی ضرورت تھی۔ یہ محنت وکاوش انسان اسی وقت تک کر سکتا ہے جب اس کے قوائے جسمانی میں توانائی ہوتی ہے۔ قویٰ میں اضمحلال کے ساتھ صناعی کے انداز مجبوراً چھوٹ جاتے ہیں۔ انسان سیدھے سادے انداز میں بے تکلفی سے اپنے مافی الضمیر کے اظہار کو غنیمت سمجھتا ہے۔ اس بے تکلفانہ اظہارِ مطلب کے لیے ہمیشہ وہ زبان کام آتی ہے جو انسان کی گھٹی میں پڑی ہوتی ہے اور جسے وہ شب وروز عام کاروبار زندگی میں بولتا چالتا ہے۔ غالب کی اردو خطوط نویسی کا آغاز (موجودہ خطوط کی روشنی میں) مارچ ۱۸۴۸ء میں ہوا، جب اُن کی عمر پچاس سال سے متجاوز تھی۔ حیاتِ انسانی میں یہ وہ منزل ہے جب آفتاب

عمر ڈھلنے لگتا ہے اور قویٰ میں اضمحلال شروع ہو جاتا ہے۔ مولانا حالی نے قلعۂ معلّٰی کے تعلق اور مصروفیات کو اردو خطوط نویسی کا باعث قرار دیا ہے۔ یہ ایک اضافی سبب ہو سکتا ہے۔ بنیادی سبب طبعی ہی تھا۔ پُرتکلف فارسی تحریروں اور بے تکلف اردو تحریروں کے سلسلے میں خود غالب کا یہ بیان زیادہ موقع ہے جو انہوں نے عبدالرزاق شاکر کے نام ایک خط میں لکھا ہے:

''بندہ نواز! فارسی میں خطوں کا لکھنا پہلے سے متروک ہے۔ پیرانہ سری وضعف کے صدموں سے محنت پژوہی جگر کاوی کی قوت مجھ میں نہیں رہی''۔

[خطوط غالب' از مہر' صفحہ ۵۳۷]

یعنی فارسی عبارت کے شکوہ کو قائم رکھنے کے لیے ''محنت پژوہی اور جگر کاوی'' کی ضرورت تھی' اور یہ طاقت اب ان میں نہیں رہی تھی۔ اس لیے وہ سیدھی سادی اور فطری زبان میں خط لکھنے پر مجبور تھے۔ انہی سیدھی سادی اور بے تکلف تحریروں کو جب غالب کے احباب اور شاگردوں نے چھاپنا چاہا' تو انہوں نے اس امر کو اپنی سخنوری کے شکوہ کے منافی سمجھا:

''اردو کے خطوط جو آپ چھاپا چاہتے ہیں' یہ بھی زائد بات ہے۔ کوئی رقعہ ایسا ہوگا کہ مَیں نے قلم سنبھال کر اور دل لگا کر لکھا ہوگا' ورنہ تحریر سرسری ہے۔ اس کی شہرت میری سخنوری کے شکوہ کے منافی ہے''۔

(خط بنام منشی شیونرائن آرام' محررہ ۱۸ نومبر ۱۸۵۸ء)

لیکن یہی ''تحریر سرسری'' درحقیقت وہ فطری تحریر تھی جس میں غالب کے جذبات و احساسات بے ساختہ طور پر ظہور پذیر ہوئے تھے۔ شروع میں خود انہیں اس کے فنی حسن کا اعتبار نہ آیا تھا لیکن بالآخر یہی اسلوب تحریر غالب کا انداز خاص بن کر اردو نثر کی رفتار ترقی پر اثر انداز ہوا۔

غالب انشا پردازی کے مروجہ اسالیب سے بخوبی آگاہ تھے اور انہوں نے اپنی فارسی تحریروں میں ان اسالیب کی پیروی بھی کی ہے۔ چودھری عبدالغفور سرور اور صاحب عالم مارہروی کے نام خطوط میں غالب نے ان اسالیب کے بارے میں تفصیل سے بحث کی ہے۔ ایک خط میں بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''بندہ کی تحقیقات یہی ہے کہ نثر تین قسم پر ہے: مقفّٰی: قافیہ ہے اور وزن نہیں' مرجز: وزن

ہے اور قافیہ نہیں؛ عاری: نہ وزن ہے، نہ قافیہ۔ مسجع ہی مقفٰی ہے کہ دونوں فقروں میں الفاظ ملائم اور مناسب ہم دگر ہوں۔ نظم میں یہ صنعت آ پڑے تو اس کو مرصّع کہتے ہیں اور نثر اس صنعت پر مشتمل ہو تو اس کو مسجع کہتے ہیں۔ اس قاعدہ کو عبدالرزاق بدل سکتا ہے، نہ صاحب قلزم ہفت گانہ، نہ یہ قطرۂ بے سروپا"۔

[خط محررہ ۱۸۵۹ء۔ خطوط غالب از مہر صفحہ ۴۸۶]

غالب نے سیدھی سادی نثر میں خط لکھنے تو شروع کر دیے تھے لیکن اردو کی یہ نثری تحریریں ابھی ان کے نزدیک مروجہ اسلوب سے بیگانہ ہونے کی وجہ سے قابل قدر نہیں تھیں۔ اردو میں ان اسالیب کی پیروی ان کے خیال میں مشکل تھی۔ علمی و ادبی تحریروں کے لیے وہ عبارت آرائی کو (جو روایتی اسلوب کا خاصہ تھی) ضروری سمجھتے تھے۔ چنانچہ جب ناظم تعلیم صوبجات متحدہ مسٹر ریڈ نے ان سے اردو نثر کی فرمائش کی تو وہ متذبذب تھے کہ کس حکایت یا روایت کو فارسی سے اردو میں منتقل کریں۔ نیز اس کا اسلوب کیا ہو:

"جناب ریڈ صاحب صاحبی کرتے ہیں۔ میں اردو میں اپنا کمال کیا ظاہر کر سکتا ہوں؟ اس میں گنجائش عبارت آرائی کی کہاں ہے؟ بہت ہوگا تو یہ ہوگا، میرا اردو بہ نسبت اَوروں کے اردو کے فصیح ہوگا۔ خیر بہ ہر حال کچھ کروں گا اور اردو میں اپنا زور قلم دکھاؤں گا"۔

[خط بنام میر مہدی مجروح۔ خطوط غالب، صفحہ ۲۵۳، ۲۵۴]

اس سے ظاہر ہے کہ خطوط سے قطع نظر ابھی وہ علمی و ادبی نگارشات کے لیے اردو کو خام پاتے تھے۔ کیونکہ ان کا انشا پردازی کا تصور فارسی کے تابع تھا جس میں قوت متخیلہ کی کارفرمائی ضروری تھی۔ بہر حال یہ طلسم بلآ خر ٹوٹ گیا اور وقت گزرنے کے ساتھ غالب کو اپنے اس اسلوب کی ندرت اور انفرادیت کا احساس ہوا جسے انہوں نے بے تکلف تحریروں کے لیے اختیار کیا تھا۔ یہ وہ اسلوب تھا جو فارسی کے مروجہ اسالیب کی پیروی سے آزاد اور جذبات و احساسات کی بے ساختہ لہر کے تابع تھا۔ تاہم یہ اسلوب صرف خطوط کے لیے تھا، تقریظوں اور دیباچوں کے لیے عبارت آرائی کا وہی عمل جاری رہا۔ بعض اوقات یہ عبارت آرائی اتنی رچی ہوتی ہے کہ اسے کسی خاص تصنیف سے مختص نہیں کیا جا سکتا۔ بعض عبارتوں میں تو ہو بہو تکرار ہے۔ مثلاً تقریظ بر کتاب بہادر

شاہ ثانی اور خاتمہ شعاع مہر کی یہ عبارت ایک آدھ لفظی تبدیلی کے سوا بالکل ایک سی ہے:

''مسائل حکیمانہ کی ہستی، ترہات ندیمانہ کی مستی، درد و درماں کے مدارج کا اظہار، افسانہ وافسوں کے مقاصد کا مدار، شکر و شکایت کا عنوان، نفرین و آفرین کا بیان، رد و قبول کی حکایت، فتح و شکست کی روایت، صرف و نحو کی راز دانی، لفظ و معنی (نثر و نظم) کی گلفشانی، جو کچھ اگلوں نے کہا ہے، جو کچھ اب کوئی کہہ رہا ہے، جو کچھ آگے کہیں گے اور قیامت تک کہتے رہیں گے، جو کچھ متعلق نیک و بد، نو و کہن سے ہے، سب وابستہ نطق سخن سے ہے۔

اب سمجھیے کہ سخن از روئے مثل کیا ہے؟ چشمہ ہے؟ ندی ہے؟ سیل ہے؟ دریا ہے؟ کیسی روانی ہے؟ کس زور کا پانی ہے؟ اس کا چڑھاؤ، اس کی رفتار، اس پر کس کا زور، کس کا اختیار؟ جدھر منہ کیا اُدھر ایک نالہ بہا دیا۔ دریا کی لہر کیا گھوڑے کی باگ ہے کہ کسی کے ہاتھ ہو؟''[۱]

علمی اور ادبی تصانیف کے اسلوب پر بھی غالب کی نظر رہتی ہے جس کا ذکر ان کتب پر تبصرہ کرتے ہوئے انہوں نے کیا ہے۔ مثلاً دیباچہ سراج المعرفت مؤلفہ سید رحمت علی خاں میں اس کے اسلوب کے بارے میں لکھتے ہیں:

''اس رسالے کی تحریر میں وہ عبارت اُردو کہ صاف اور بے تکلف ہو، خرچ کریں[۲]''۔

داستان جو سنانے کی چیز ہے، اس کا اسلوب علمی تصنیف کے تحریری اسلوب کے مقابلے میں بول چال کے زیادہ قریب ہوتا ہے۔ چنانچہ خواجہ امان کی داستان پر تبصرہ کرتے ہوئے غالب لکھتے ہیں:

''عبارت آرائی کو ترک کیا ہے، گویا تقریر کو پیرایہ تحریر دیا ہے[۳]''۔

بعض علمی مسائل کی بحث کے سلسلے میں غالب نے جو رسائل یا خطوط لکھے ہیں، ان کا پیرایۂ بیان سادہ، رواں اور منطقی ہے۔ مثلاً نامۂ غالب کا اُسلوب، اس میں جذبات بھی ہیں لیکن طرزِ بیان سادہ اور مدلل ہے۔ کہیں کہیں قوافی کا التزام بھی ہے لیکن زیادہ تر قافیے بے ساختہ ہیں۔ چونکہ یہ رسالہ خط کی شکل میں لکھا گیا ہے اس لیے گفتگو اور مکالمے کی صورت بھی کہیں کہیں موجود ہے۔

لیکن اردو نثر میں مرزا غالب کا کارنامۂ خاص خطوط ہی ہیں، جن میں وہ مطلب نویسی

---

(۱) خطوطِ غالب، صفحہ ۶۴۳، ۶۴۲

(۲) خطوطِ غالب، صفحہ ۶۳۸ (۳) خطوطِ غالب، صفحہ ۶۴۰

کو بنیادی حیثیت دیتے ہیں۔ خط کا اصل مقصد بھی ادائے مطلب ہی ہوتا ہے۔ مکتوب نگار اور مکتوب الیہ جن کاروباری امور اور معاملات کی خاطر خط کو ذریعہ اظہار بناتے ہیں، ان کا بنیادی تقاضا یہی ہے۔ غالب کی اردو خطوط نویسی بھی چونکہ انھی امور و معاملات کی خاطر شروع ہوئی تھی، اس لیے خطوط کے اسلوب میں سادگی کے ساتھ ادائے مطلب کو ہر بات پر فوقیت حاصل ہے۔ غالب نے ''پنج آہنگ'' کے دیباچے میں بھی خطوط نویسی کے رسمی انداز پر کڑی تنقید کی ہے:

''یگانگی ایں روش از شیوۂ غالب مستمند نہ چنداں است کہ گفتن نیاز داشتہ باشد و اداشناس داند کہ ہنجار سخن و رنگارش ایں است کہ چون کلک و ورق بکف گیرم، مکتوب الیہ را بلفظی کہ فراخور حالت اوست، در سر آغاز صفحہ آواز دہم، و زمزمہ سنج مدعا گردم۔ القاب و آداب و خیریت گوئی و عافیت جوئی حشو زائد است و هنجگان حشو را دفع نہند''۱

غالب نے خطوط نویسی کے اس رسمی انداز کو ''محمد شاہی روشیں'' کہہ کر اس کی سخت مذمت کی ہے اور احباب کو یہ روش ترک کرنے اور اس انداز کو اختیار کرنے کا بالواسطہ مشورہ دیا ہے جس کے وہ خود بانی اور موجد تھے۔ انہوں نے اپنے خطوط میں جا بجا اس انداز خاص کی خصوصیات بھی بیان کی ہیں۔ مثلاً:

''ہاں صاحب، کیا چاہتے ہو؟ مجتہد العصر کے مسودے کو اصلاح دے کر بھیج دیا، اب اور کیا لکھوں؟ تم میرے ہم عمر نہیں جو سلام لکھوں، بیٹے فقیر نہیں جو دعا لکھوں۔ تمہارا دماغ چل گیا ہے۔ لفافے کو کریدا کرو، مسودہ کو بار بار دیکھا کرو، پاؤ گے کیا؟ یعنی تم کو وہ محمد شاہی روشیں پسند ہیں!'' یہاں خیریت ہے، وہاں کی عافیت مطلوب ہے۔ خط تمھارا بہت دنوں کے بعد پہنچا۔ جی خوش ہوا۔ مسودہ بعد اصلاح کے بھیجا جاتا ہے۔ برخوردار میر سرفراز حسین کو دینا اور دعا کہنا اور وہاں حکیم میر اشرف علی اور میر افضل علی کو بھی دعا کہنا۔ لازمۂ سعادت مندی یہ ہے کہ ہمیشہ اسی طرح خط بھیجتے رہو''۔

کیوں، سچ کہو، اگلوں کے خطوط کی تحریر کی یہی طرز تھی یا اور؟ ہائے، کیا اچھا شیوہ ہے۔ جب تک یوں نہ لکھوں، وہ خط ہی نہیں ہے۔ چاہ بے آب ہے، ابر بے باراں ہے، نخل

(۱) پنج آہنگ (کلیات نثر غالب) مطبوعہ ۱۸۷۱ء، صفحہ ۵

بے میوہ ہے، خانہ بے چراغ ہے، چراغ بے نور ہے۔ ہم جانتے ہیں، تم زندہ ہو، تم جانتے ہو، ہم زندہ ہیں۔ امرِ ضروری لکھ لیا، زوائد کو اور وقت پر موقوف رکھا۔ اور اگر تمھاری خوشنودی اسی طرح کی نگارش پر منحصر ہے، تو بھائی ساڑھے تین سطریں ویسی بھی میں نے لکھ دیں"۔

[خط بنام میر مہدی مجروح، ۱۶ مئی ۱۸۶۲ء خطوطِ غالب، صفحہ ۳۰۸]

"جواب لکھنے میں جو میری طرف سے قصور ہوتا ہے، اس کے دو سبب ہیں: ایک تو یہ کہ حضرت مہینا بھر میں نوپتے لکھتے ہیں۔ میں کہاں تک یاد رکھا کروں؟ ایک مکان ہو تو لکھ رکھوں۔ دوسرا سبب یہ ہے کہ شوقیہ خطوط کا جواب کہاں تک لکھوں اور کیا لکھوں؟ میں نے آئین نامہ نگاری چھوڑ کر مطلب نویسی پر مدار رکھا ہے۔ جب مطلب ضروری التحریر نہ ہو تو کیا لکھوں؟"

[خط بنام قاضی عبدالجمیل جنوں، ۹ ربیع الاول ۱۲۷۲ھ، ۲۰ نومبر ۱۸۵۵ء، صفحہ ۵۲۰]

مطلب نویسی کے سلسلے میں جہاں غالب خود اس امر کی کوشش کرتے ہیں کہ مکتوب الیہ تک ان کی بات پوری طرح پہنچ جائے اور درمیان میں کوئی ابہام نہ رہ جائے، وہاں وہ دوسروں سے بھی اسی وضاحت و صراحت کی توقع رکھتے ہیں۔ چنانچہ مرزا حاتم علی بیگ مہر کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

"بھائی میرے سر کی قسم، اس خط کا جواب ضرور لکھنا اور ایسا واضح لکھنا کہ مجھ سا کُند ذہن اچھی طرح اس کو سمجھ لے"۔

[خطوطِ غالب، صفحہ ۲۲۹]

غالب نے اردو نثر نگاری اس وقت شروع کی تھی جب ان کی ادبی شخصیت اوجِ کمال تک پہنچ چکی تھی۔ اس لیے اس سادہ مطلب نویسی میں بھی ان کی منجھی ہوئی ادبی شخصیت آخر پُرکاری کا ایک انداز نکال لیتی ہے، اور پھر وہ اس سادہ پُرکار انداز میں بڑی دلچسپی لینے لگتے ہیں۔ خصوصاً ۱۸۵۷ء کے واقعۂ انقلاب کا غالب کی خطوط نویسی پر گہرا اثر پڑا۔

یہ وہ پُر آشوب دَور تھا جب دہلی پر آلام و مصائب کے پہاڑ ٹوٹ پڑے تھے۔ ستمبر ۱۸۵۷ء میں دہلی پر دوبارہ انگریزی قبضہ ہُوا تو مسلمانوں کو شہر بدر کر دیا گیا۔ غالب بوجوہ

دہلی ہی میں رہے۔[1] لیکن دہلی کے اُجڑنے کا ان کی مجلسی زندگی پر گہرا اثر پڑا۔ جن دوستوں سے شب و روز ملاقاتیں ہوتی تھیں۔ مسائل روزمرہ پر گفتگوئیں ہوتی تھیں۔ نجی و ذاتی معاملات پر راز و نیاز کی باتیں ہوتی تھیں۔ وہ سب اِدھر اُدھر بکھر گئے۔ حالات معمول پر آنے کے بعد ڈاک کا انتظام بحال ہو گیا۔ لیکن مسلمانوں کی آبادی اور مجلسی زندگی کی بحالی کئی سال تک نہ ہو سکی۔ اس مجلسی خلا کو پُر کرنے اور ویرانۂ دل کو آباد کرنے کا اب صرف ایک ہی ذریعہ تھا اور وہ تھا مکتوب نگاری! غالب کے لیے یہ سہارا ایک نعمت غیر مترقبہ بن گیا۔ ویرانی دل کے تلخ احساس اور اس کے مداوے کی چند مثالیں دیکھئے:

''کیوں صاحب! مجھ سے کیوں خفا ہو؟ آج مہینہ بھر ہو گیا ہو گا یا بعد دو چار دن کے ہو جائے گا کہ آپ کا خط نہیں آیا۔ انصاف کرو، کتنا کثیر الاحباب آدمی تھا۔ کوئی وقت ایسا نہ تھا کہ میرے پاس دو چار دوست نہ ہوتے ہوں۔''

[خط بنام منشی ہرگوپال تفتہ، نگاشتہ شنبہ ۱۹ جون ۱۸۵۸ء]

''کیوں صاحب، روٹھے ہی رہو گے یا کبھی منو گے بھی؟ اور اگر کسی طرح نہیں منتے تو روٹھنے کی وجہ تو لکھو۔ میں اس تنہائی میں صرف خطوں کے بھروسے جیتا ہوں۔ یعنی جس کا خط آیا میں نے جانا کہ وہ شخص تشریف لایا۔ خدا کا احسان ہے کہ کوئی دن ایسا نہیں ہوتا، جو اطراف و جوانب سے دو چار خط نہیں آ رہتے ہوں۔ بلکہ ایسا بھی دن ہوتا ہے کہ دو دو بار ڈاک کا ہرکارہ خط لاتا ہے، ایک دو صبح کو، ایک دو شام کو۔ میری دل لگی ہو جاتی ہے۔ دن ان کے پڑھنے اور جواب لکھنے میں گزر جاتا ہے۔ یہ کیا سبب؟ دس دس دن بارہ بارہ دن سے تمہارا خط نہیں آیا، یعنی تم نہیں آئے۔ خط لکھو صاحب، نہ لکھنے کی وجہ لکھو۔ آدھ آنے میں بخل نہ کرو۔ ایسا ہی ہے تو بیرنگ بھیجو۔''

[خط بنام تفتہ، سوموار ۲۷ دسمبر ۱۸۵۸ء]

''مار ڈالا یار تیری جواب طلبی نے۔ اس چرخ کج رفتار کا برا ہو۔ ہم نے اس کا کیا بگاڑا تھا؟ ملک و مال و جاہ و جلال کچھ نہیں رکھتے تھے۔ ایک گوشہ و توشہ تھا۔ چند مفلس و بے نوا

(۱) اس کی تفصیل غالب نے اپنے خط بنام منشی ہرگوپال تفتہ (مورخہ ۵ دسمبر ۱۸۵۷ء) میں لکھی ہے (خطوط غالب، صفحہ ۱۵۲)

ایک جگہ فراہم ہو کر ہنس بول لیتے تھے:

سو بھی نہ تو کوئی دم دیکھ سکا (اے)[1] فلک

اور تو یاں کچھ نہ تھا ایک مگر دیکھنا

یاد رہے، یہ شعر خواجہ میر درد کا ہے۔

''کل سے مجھ کو خواجہ میکش بہت یاد آتا ہے''۔ سو صاحب، اب تم ہی بتاؤ کہ میں تم کو کیا لکھوں؟ وہ صحبتیں اور تقریریں جو یاد کرتے ہو، اور تو کچھ بن نہیں آتی۔ مجھ سے خط پر خط لکھواتے ہو۔ آنسوؤں سے پیاس نہیں بجھتی، یہ تحریر تلافی اس تقریر کی نہیں کر سکتی۔ بہر حال کچھ لکھتا ہوں۔ دیکھو، کیا لکھتا ہوں۔

[بنام میر مہدی مجروح، اپریل ۱۸۵۹ء]

''نور چشم، راحت جان، میر سرفراز حسین جیتے رہو تمہارے دستخطی خط نے میرے ساتھ وہ کیا، جو بوئے پیرہن نے یعقوب کے ساتھ کیا۔ میاں، یہ ہم تم بوڑھے ہیں یا جوان ہیں، توانا ہیں یا ناتواں ہیں، بڑے بیش قیمت ہیں، یعنی بہر حال غنیمت ہیں۔ کوئی جَلا بُھنا کہتا ہے:

یادگارِ زمانہ ہیں ہم لوگ

یاد رکھنا فسانہ ہیں ہم لوگ

وہی بالا خانہ ہے اور وہی میں ہوں۔ سیڑھیوں پر نظر ہے کہ وہ میر مہدی آئے، وہ یوسف میرزا آئے، وہ میرن آئے، وہ یوسف علی خان آئے۔ مرے ہوؤں کا نام نہیں لیتا، بچھڑے ہوؤں میں سے کچھ گنے ہیں۔ اللہ، اللہ، ہزاروں کا میں ماتم دار ہوں۔ میں مروں گا تو مجھ کو کون روئے گا۔ سنو غالب، رونا پیٹنا کیسا۔ کچھ اختلاط کی باتیں کرو کہو میر سرفراز حسین سے کہ یہ خط میر مہدی کو پڑھواؤ اور میرن صاحب کو بلواؤ۔

[بنام میر سرفراز حسین۔ خطوط غالب، صفحہ ۳۲۰]

چنانچہ واقعہ انقلاب کے بعد غالب کی خطوط نویسی ایک نئے دور میں داخل ہوئی۔ اب خطوط صرف

---

(۱) مطبوعہ خط میں ''ایک''۔ دیوان درد میں ''اے''۔

ادائے مطلب ہی کا ذریعہ نہیں رہتے۔ بلکہ مجلسی راز و نیاز کا وسیلہ بھی بن جاتے ہیں۔اس میں جذبات واحساسات بھی ہوتے ہیں اور تصورات وتخیلات بھی۔ واقعہ نگاری بھی ہوتی ہے اور مرقع کشی بھی۔ اور یہی وہ عناصر ہیں جو خطوط کو کاروباری سطح سے بلند کرکے ان کو ادب کے دائرے میں لے آتے ہیں۔ادب کی یہ وہ خاموش فضا ہے جہاں احباب کی ملاقات ہوتی ہے۔ خط کو عام طور پر نصف ملاقات کا مترادف کہا جاتا ہے لیکن اس خاموش فضا میں پہنچ کر خط کبھی کبھی پوری ملاقات بلکہ اس سے بھی کچھ زائد بن جاتا ہے۔ اسلئے کہ جو باتیں انسان بالمشافہ گفتگو میں بھی نہیں کہہ پاتا وہ خط میں کہہ گزرتا ہے۔خطوط نگاری کا یہ وہ نیا انداز تھا جو واقعہ انقلاب کے بعد تنہائی کی خاموش فضا میں پیدا ہوا۔ یہ انداز غالب کے شاگردوں اور دوستوں کے لئے ایک انمول تحفہ تھا۔ بعض عزیزوں نے یہ سوچا کہ یہ جنس خاص اگر عام ہو جائے تو کیا مضائقہ ہے۔ چنانچہ تفتہ اور آرام نے ان خطوط کی اشاعت کے لئے غالب سے اجازت طلب کی۔ غالب نے سختی سے اس تجویز کو مسترد کر دیا۔ لیکن اب قدرتی طور پر انہیں بھی اپنے شیوۂ خاص کی انفرادیت کا احساس ہونے لگا اور وہ اس پر اظہار فخر بھی کرنے لگے۔ اپنے کئی خطوط میں غالب نے اپنے انداز نگارش کی خصوصیات پر اظہار خیال کیا ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ فرمائیے:

''کاشانۂ دل کے ماہ دو ہفتہ منشی ہرگوپال تفتہ تحریر میں کیا کیا سحر طرازیاں کرتے ہیں۔ اب ضرور آ پڑا ہے کہ ہم بھی جواب اسی انداز سے لکھیں''۔

[نگاشتہ جمعہ ۱۸ جون ۱۸۵۲ء خطوط غالب، صفحہ ۱۳۵]

''بھائی مجھ میں تم میں نامہ نگاری کا ہے کو ہے، مکالمہ ہے۔''

[خط بنام تفتہ، جمعہ ۱۷ ستمبر ۱۸۵۸ء خطوط غالب، ص ۱۷۱]

''تم سمجھے؟ میں تمہارے اور منشی نبی بخش صاحب اور جناب مرزا حاتم علی صاحب کے خطوط کے آنے کو تمہارا اور ان کا آنا سمجھتا ہوں۔ تحریر گویا وہ مکالمہ ہے جو باہم ہوا کرتا ہے۔ پھر تم کہو کہ مکالمہ کیوں موقوف ہے؟ اور کیا ''یہ ''،'' وہاں کیا ہو رہا ہے؟''

[بنام تفتہ، ۱۱ اکتوبر ۱۸۵۸ء، خطوط غالب ص ۱۷۴]

''مطالب اور مقاصد تمام ہوئے اور ہم تم بزبان قلم باہم گرم ہم کلام ہوئے۔''

[بنام مرزا حاتم علی بیگ مہر ۲۰ ستمبر ۱۸۵۸ء، خطوط غالب ص ۲۲۲]

''مرزا صاحب، مَیں نے وہ انداز تحریر ایجاد کیا ہے کہ مراسلہ کو مکالمہ بنا دیا ہے۔ ہزار کوس سے بزبان قلم باتیں کیا کرو۔ ہجر میں وصال کے مزے لیا کرو۔''

[بنام حاتم علی بیگ مہر، خطوط غالب، ص ۲۲۷]

''بھائی مجھ کو اس مصیبت میں کیا ہنسی آتی ہے کہ ہم تم اور مرزا تفتہ میں مراسلت و مکالمت ہوگئی ہے روز باتیں کرتے ہیں۔ اللہ اللہ یہ دن بھی یاد رہیں گے۔ خط سے خط لکھے گئے ہیں۔ مجھ کو اکثر اوقات لفافے بنانے میں گزرتے ہیں۔ اگر خط نہ لکھوں گا تو لفافے بناؤں گا۔ غنیمت ہے کہ محصول آدھ آنہ ہے ورنہ باتیں کرنے کا مزا معلوم ہوتا۔''

[بنام منشی نبی بخش حقیر، چہار شنبہ ۱۲ ستمبر ۱۸۵۸ء]

''واہ واسید صاحب، تم بڑی عبارت آرائیاں کرنے لگے، نثر میں خود نمایاں کرنے لگے۔ کئی دن سے تمھارے خط کے جواب کی فکر میں ہوں مگر جاڑے نے بے حس و حرکت کر دیا ہے، آج جو بہ سبب ابر کے وہ سردی نہیں تو مَیں نے خط لکھنے کا قصد کیا ہے، مگر حیران ہوں کہ کیا سحر سازی کروں۔ بھائی تم اردو کے مرزا قتیل بن گئے ہو۔ اُردو بازار میں نہر کے کنارے رہتے رہتے رو دنیل بن گئے ہو۔ کیا قتیل، کیا رو دنیل۔ یہ سب ہنسی کی باتیں ہیں۔ لو سنو، اب تمھاری دتی کی باتیں کرتے ہیں۔''

[بنام میر مہدی مجروح، بدھ ۲۳ دسمبر ۱۸۵۸ء]

''میر مہدی جیتے رہو، آفرین، صد ہزار آفرین۔ اردو عبارت لکھنے کا اچھا ڈھنگ پیدا کیا ہے کہ مجھ کو رشک آنے لگا۔ سنو، دلی کے تمام مال و متاع وزر و گوہر کی لوٹ پنجاب احاطہ میں گئی ہے یہ طرز عبارت خاص میری دولت تھی سو ایک ظالم پانی پتی، انصاریوں کے محلے کا رہنے والا لوٹ لے گیا(۱)۔ مگر مَیں نے اس کو بحل کیا۔ اللہ برکت دے۔''

[بنام میر مہدی مجروح، ۷ مارچ ۱۸۵۹ء]

(۱) یعنی میر مہدی مجروح۔

غالب کا یہ انداز خاص جو واقعہ انقلاب سے پہلے بعض خطوط میں (خصوصاً تفتہ کے نام لکھے گئے) جھلکتا تھا، انقلاب کے بعد قریبی احباب کے خطوط میں ان کا شیوۂ خاص بن گیا۔ تاہم عامیانہ (کاروباری) اور ادبیانہ تحریر کا فرق ان کے پیش نظر ضرور رہا۔ جب ان کے خطوط زیر طباعت تھے تو انہوں نے خواجہ غلام غوث بے خبر کو (جن کے زیر اہتمام یہ خطوط چھپ رہے تھے) اس امر کی وضاحت کرتے ہوئے یہ لکھا:

''غرض کہ عامیانہ لکھنا اختیار کیا ہے۔ اب یہ عبارت جو تم کو لکھ رہا ہوں، یہ لائق شمول مجموعہ نثر اردو کہاں ہے؟ یقین جانتا ہوں کہ ایسی نثروں کو آپ خود نہ درج کریں گے۔''

[خطوط غالب صفحہ ۲۵۵]

اس اعتبار سے دیکھا جائے تو غالب کے خطوط میں اسالیب بیان کا خاصا تنوع ہے۔ اسالیب کے اس تنوع میں غالب کی شوخ اور بذلہ سنج شخصیت کی جھلک تو ہر جگہ موجود ہے۔ البتہ جن احباب سے زیادہ گہرے اور بے تکلفانہ مراسم ہیں، ان کے نام خطوط میں یہ کیفیات زیادہ نمایاں ہیں۔ غالب ہجوم غم والم میں زندگی سے نباہ کے لئے زندہ دلی اور شگفتہ مزاجی کو ضروری سمجھتے تھے۔ یہ جوہر ان کی ذات میں بدرجۂ اتم موجود تھا اور مرتے دم تک ساتھ رہا۔ زندہ دلی کا یہی احساس وہ اپنے احباب میں بھی پیدا کرنا چاہتے تھے۔ اس کے لئے انہوں نے خطوط کو ذریعہ بنایا تھا۔ اس غایت کے نتیجے میں غالب کا ادبی اسلوب گونا گوں محاسن کا حامل بنا ہے۔ بعض خطوط جن میں غالب نے اپنی ذہنی کیفیات اور قلبی واردات کے مرقعے پیش کیے ہیں، بالکل افسانے اور انشائیے معلوم ہوتے ہیں۔ مثلاً علاؤالدین علائی کے نام خط نشان ۹ (صفحہ ۶۹ خطوط غالب)، نشان ۲۲ (ص ۸۷۔۸۹)، قربان علی بیگ سالک کے نام خط، نشان ا (صفحہ ۱۱۹)، ہرگوپال تفتہ کے نام خط نشان ۷ (ص ۱۳۵)، نشان ۲۸ (صفحہ ۱۵۲) نشان ۶۰ (ص ۱۷۸) حاتم علی بیگ مہر کے نام خط نشان ۱۷، ۱۹، ۲۰ (ص ۲۳۴۔ ۲۳۶)، میر مہدی مجروح کے نام خط نشان ۹ (ص ۲۸۰۔ ۲۸۱) نشان ۲۱ (ص ۲۹۳ وغیرہ وغیرہ) [1]۔

غالب نے اپنے بعض خطوط میں باتیں کرنے اور خبریں سنانے کا جو انداز اختیار کیا ہے، اس سے

---

(۱) میرے پیش نظر خطوط غالب مرتبہ غلام رسول مہر مطبوعہ ۱۹۶۲ء والا نسخہ ہے۔

ان کے اسلوب میں بیانیہ نگاری، مرقع نگاری اور مکالمہ نگاری کی صورتیں پیدا ہوگئی ہیں۔ واقعات و حالات کے بیان میں فقرے چھوٹے چھوٹے، مسلسل اور رواں ہوتے ہیں۔ ماحول کی تصویریں پیش کرتے ہوئے بعض معمولی معمولی جزئیات وہ اس خوبی سے پیش کرجاتے ہیں کہ جیتا جاگتا ماحول مکتوب الیہ اور قاری کے سامنے آجاتا ہے۔ گفتگو کا انداز اور مکالمے ان مرقعوں کو متحرک بنا دیتے ہیں۔ اُردو نثر میں مختصر افسانے، انشائیے اور ڈرامے کی اصناف غالب کے بعد جنم لیتی ہیں، لیکن ان اصناف ادب کے لئے اسالیب بیان کے نمونے غالب کے خطوط میں ملتے ہیں اور یہ نمونے اتنے حقیقی اور جاندار ہیں کہ افسانے، انشائیے اور ڈرامے سے زیادہ لطف و کیف کے حامل ہیں۔ مکالمہ نگاری کے سلسلے میں مندرجہ ذیل خطوط خاص طور پر قابل ذکر ہیں: خط بنام علاؤ الدین علائی، نشان ۸ (ص ۶۹)، نشان ۲۴ (ص ۹۱) میر مہدی مجروح کے نام خط، نشان ۲۳ (ص ۳۰۲۔ ۳۰۳) نواب یوسف مرزا کے نام خط نشان ۱ (ص ۲۰۴) وغیرہ

غالب اپنے بعض خطوط میں ادبی لحاظ سے فقروں کو پُر لطف بنانے کے لئے قوافی کا بھی استعمال کرتے ہیں۔ یہ قوافی اکثر بے ساختہ اور برجستہ ہوتے ہیں، فقروں کی نحوی ساخت ان سے متاثر نہیں ہوتی۔ البتہ جہاں التزاماً قافیے کا استعمال ہوا ہے وہاں فقرے کی ساخت اس تکلف اور اہتمام کو صاف ظاہر کر دیتی ہے۔ ادبی لحاظ سے مقفّیٰ نثر کے بے ساختہ ٹکڑے دلچسپ ہیں۔ لیکن غالب کی اردو نثر کی دلکشی کا انحصار قوافی پر نہیں ہے بلکہ اُس مجلسی احساس اور جذبۂ رفاقت پر ہے جس کے مطابق وہ مراسلے کو مکالمہ اور تحریر کو تقریر کا رنگ دے رہے تھے۔ انہی جذبات و احساسات کے پُر خلوص اظہار نے خطوط غالب کے ادبی حسن کو نمایاں کیا ہے۔

لیکن غالب کے سبھی خطوط اس ادبی فضا کے حامل نہیں ہیں۔ کئی خطوط کاروباری مسائل اور دنیوی معاملات کے بارے میں ہیں۔ غالب کی معاملہ شناسی اور حالات زمانہ کے مطابق کارروائی اور مفاہمت کا احساس ان خطوط سے بخوبی واضح ہے۔ ان خطوط میں جذبے اور خیال سے زیادہ حقیقت پسندی کا ثبوت ملتا ہے۔ بعض خطوط میں علمی بحثیں ہیں۔ وہ خطوط جن میں علمی نکات بیان ہوئے ہیں ان کا انداز بیان بڑا سادہ اور منطقی ہوتا ہے۔ سادگی کے ساتھ وضاحت و صراحت غالب کا شیوۂ خاص بن گیا تھا۔ سادہ علمی نثر کا یہ نمونہ ملاحظہ فرمایئے:

''مذکیر و تانیث کا کوئی قاعدہ منضبط نہیں کہ جس پر حکم کیا جائے۔ جو جس کے کانوں کو لگے جس کو جس کا دل قبول کرے۔ اس طرح کہو۔ رتھ میرے نزدیک مذکر ہے، یعنی رتھ آیا' لیکن جمع میں کیا کروں گا؟ ناچار مؤنث بولنا پڑے گا، یعنی''رتھیں آئیں'' خبر مؤنث ہے بہ اتفاق، مگر کاغذ اخبار، اس کو خود سمجھو لو کہ تمہارا دل کیا قبول کرتا ہے۔ میں تو مذکر کہوں گا۔ یعنی اخبار آیا۔ پیر ہوئی یا ہوا؟ یہ منطق عوام کا ہے۔ ہمیں اس سے کچھ کام نہیں۔ ہم کہیں گے کہ دوشنبہ ہوا، پیر کا دن ہوا، نری پیر ہوئی یا پیر ہوا، ہم کیوں بولیں گے؟'' ''بلبل'' میرے نزدیک مؤنث ہے۔ جمع اس کی بلبلیں۔ طوطی بولتا ہے، بلبل بولتی ہے۔

[خطوط غالب، صفحہ ۳۱۷]

غالب کی ادبی نثر کے ساتھ ساتھ علمی نثر کے یہ نمونے اس اعتبار سے خاص اہمیت رکھتے ہیں کہ اُردو نثر کے فروغ و ترقی میں جہاں اس وقت ادبی اظہار کے لئے نئے نئے پیرایوں کی ضرورت تھی، وہاں علمی اظہار کے لئے بھی اسی ٹھوس اور منطقی پیرائے کی ضرورت تھی جس میں کوئی حشو و زوائد نہ ہوں۔ بلکہ علمی معلومات اس سادگی، سلاست اور روانی کے ساتھ طالبان علم تک پہنچا دی جائیں کہ ان کے ذہن پر زبان اور طرز بیان کا کوئی بوجھ بھی نہ پڑے، اور وہ علمی حقائق تک بہ سہولت پہنچ جائیں۔

اظہار مطالب کے لئے اردو زبان ہر دَور میں اپنے دامن کو وسیع کرتی رہی ہے۔ غالب کے زمانے میں انگریزی اثر و نفوذ شروع ہو چکا تھا۔ نئی حکومت کے ساتھ نئی تہذیبی، تمدّنی اور علمی اصطلاحات اور الفاظ اردو کے دامن میں آ رہے تھے۔ غالب انگریزی نہیں جانتے تھے۔ البتہ انگریزی کے جو الفاظ اس دَور میں عام طور پر رائج ہو چکے تھے، اُن سے آگاہ تھے۔ چنانچہ اُن کے خطوط میں انگریزی کے اکثر الفاظ مل جاتے ہیں۔ مثلاً ٹکٹ، پوسٹ پیڈ، رجسٹری، بکس، پاکٹ (پیکٹ)، پارسل، پمفلٹ پاکٹ، کونسل، لیکور (شراب)، سارٹیفیکیٹ کیمپ، چیف سیکرٹری، کمشنر، ڈپٹی کمشنر، رپورٹ، ایگریمنٹ، پولٹیکل، گورنمنٹ وغیرہ یہ الفاظ کثرت سے اور بے ساختہ طور پر ان کی تحریروں میں آ جاتے ہیں۔ مثلاً:

''یوں تمام عمر بخوشی گزر جائے لیکن تم کے برس ، کے مہینے ، کے ہفتے کا ایگریمنٹ لکھتے ہو۔''

[خطوط غالب، صفحہ ۸۰]

''یقین ہے تم رپورٹ کرو گے تو اس امر کی منظوری کا حکم آ جائے گا۔''

[خطوط غالب، صفحہ ۱۱۶]

''یقین ہے کہ یہ خط کل پرسوں اور وہ پاکٹ پانچ دن میں پہنچ جائے۔''

[خطوط غالب، صفحہ ۱۵۷]

سرمایہ زبان میں اس توسیع کے علاوہ ادبی و علمی اظہارات کے لئے مناسب پیرائے اختیار کرنا، غالب کا یہ وہ کارنامۂ خاص ہے جو اُردو زبان و ادب میں قابل قدر ہے۔ غالب کے بعد سرسید کا دورِ اُردو نثر کے فروغ کے لئے عہد زریں کہلاتا ہے، اور غالب نے اردو کو اس مقام تک پہنچانے میں تاریخی کردار سرانجام دیا ہے جو نا قابل فراموش ہے۔

محاسنِ خطوطِ غالب

مکتوب نگاری غالب کے مزاج کا جزو لاینفک معلوم ہوتی ہے جس کی اہمیت کا اظہار ان کے کلام میں بھی جابجا ہوا ہے:

یہ جانتا ہوں کہ تو اور پاسخِ مکتوب
مگر، ستم زدہ ہوں، ذوقِ خامہ فرسا کا

یہ "ذوقِ خامہ فرسائی" خطوطِ غالب کی فنی قدر و قیمت کا جائزہ لینے کے لیے کلیدی حیثیت رکھتا ہے۔ باایں ہمہ غالب نے جب اُردو میں خط نگاری کا سلسلہ شروع کیا تو ابتدا میں اُن کے ذہن میں کسی ادبی تخلیق یا نادر تحریر کا خیال اُن کے ذہن میں نہیں تھا۔ سیدھی سادی اردو نثر کے بارے میں اُن کے ذہن میں یہ خیال آ بھی کیسے سکتا تھا۔ انہیں تو ایک عرصے تک اپنے فارسی کلام کے مقابلے میں اردو کلام کی عظمت سے بھی انکار ہی رہا:

فارسی بیں تا بہ بینی نقش ہائے رنگ رنگ
بگذر از مجموعۂ اُردو کہ بے رنگِ من است

پھر ایک ایسے زمانے میں جب علما و فضلا اپنی نثری تحریریں ابھی فارسی ہی میں لکھ رہے تھے، غالب اپنی "سادہ" اردو تحریریں کیونکر ادبی دنیا کے سامنے پیش کر سکتے تھے۔ [۱] بہر حال

---

(۱) خطوطِ غالب کی طباعت کا سوال سب سے پہلے نومبر ۱۸۵۸ء میں منشی ہرگوپال اور شیونرائن نے غالباً آپس میں صلاح مشورہ کر کے اٹھایا۔ غالب نے اس اجازت طلبی پر جو سخت رویہ اختیار کیا، اس سے مذکورہ بالا بیان کی بہ خوبی تائید ہوتی ہے۔ چنانچہ ان عزیزوں کے خطوط کے جواب میں لکھتے ہیں:

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

زمانے کا فیصلہ زیادہ قوی اور اٹل ہوتا ہے۔ غالب کا اردو کلام اور اس سے بھی زیادہ ان کے اردو خطوط اپنے گوناگوں فکری وفنی محاسن کی بدولت ادب میں ایک بلند مقام حاصل کر چکے ہیں۔ غالب کو یہ مقام فطری صلاحیتوں کے علاوہ فنی ارتقاء کی چند منزلیں طے کر کے حاصل ہوا۔

غالب ایک جدت پسند فنکار تھے۔ یہ انا کا شدید احساس اور جدت پسندی کا تقاضا ہی تھا جو انہیں تقلید سے اجتہاد کی طرف لے آیا اور پھر وہ فکر وفن کی اُن اچھوتی فضاؤں تک پہنچے جہاں عظیم ادب کی تخلیق ہوتی ہے۔ غالب نے شعر وسخن کا آغاز متاخر شعرائے فارسی مرزا عبدالقادر بیدل، مرزا جلال اسیر، شوکت بخاری وغیرہ کی پیروی میں کیا۔ انہوں نے طرز بیدل کی پیروی کا اعتراف ایک مقطعے میں یوں کیا ہے:

طرز بیدل میں ریختہ لکھنا
اسد اللہ خاں قیامت ہے

تقلید کی اس راہ پر کچھ عرصہ گام زن رہنے کے بعد وہ اس سے آزادی حاصل کر لیتے ہیں جس کا اعتراف وہ اپنے ایک خط میں اس طرح کرتے ہیں:

''پندرہ برس کی عمر سے پچیس برس کی عمر تک مضامین خیالی لکھا کیا۔ دس برس میں بڑا دیوان جمع ہوگیا۔ آخر جب تمیز آئی تو اُس دیوان کو دُور کیا۔ اوراق یک قلم چاک کیے۔

''رقعات کے چھاپے جانے میں ہماری خوشی نہیں ہے۔ لڑکوں کی سی ضد نہ کرو، اور اگر تمھاری خوشی اسی میں ہے تو صاحب مجھ سے نہ پوچھو، تم کو اختیار ہے۔ یہ امر میرے خلاف رائے ہے۔''

(خط بنام ہرگوپال تفتہ مجریہ شنبہ ۲۰ نومبر ۱۸۵۸ء)

''اُردو کے خطوط جو آپ چھاپا چاہتے ہیں، یہ بھی زائد بات ہے۔ کوئی رقعہ ایسا ہوگا کہ میں نے قلم سنبھال کر اور دل لگا کر لکھا ہوگا، ورنہ صرف تحریر سرسری ہے۔ اس کی شہرت میری سخنوری کی شکوہ کے منافی ہے۔ اس سے قطع نظر، کیا ضرور ہے کہ ہمارے آپس کے معاملات اوروں پر ظاہر ہوں۔ خلاصہ یہ کہ ان رقعات کا چھاپا جانا میرے خلاف طبع ہے۔''

(خط بنام شیونرائن آرام مجریہ پنج شنبہ ۱۸ نومبر ۱۸۵۸ء)

دس پندرہ شعر واسطے نمونہ کے دیوان حال میں رہنے دیے''۔
(خط بنام عبدالرزاق شاکر، خطوط غالب، مرتبہ مولانا مہر طبع لاہور ۱۹۶۲ء صفحہ ۵۴۰)
مشق سخن کی ابتدائی منزلیں بڑی کٹھن اور صبر آزما تھیں۔ بعض معاصرین انہیں مہمل گو قرار دے رہے تھے، اور وہ بڑی شان استغنا سے اس قسم کے حملوں کو روکر رہے تھے:

نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا
گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی

لیکن غالب اگر ایک طرف رومانی مزاج کے حامل تھے تو دوسری طرف ایک حقیقت پسند ذہن بھی رکھتے تھے۔ ان کی معاملہ شناسی اور حالات سے مفاہمت و مطابقت پیدا کر کے زندگی کو خوشگوار بنانے کا ثبوت اکثر خطوط سے ملتا ہے۔ اس معاملے میں بھی انہیں اپنی پچھلی روش ترک کر کے عصری فنی تقاضوں کا پاس کرنا پڑا۔ اور پھر معنوی عظمت اور شوکت لفظی کے حسین امتزاج سے لے کر سادہ و سہل ممتنع انداز تک، انہوں نے فن شعر کا وہ ''تاج محل'' بنا کر پیش کیا کہ جس کی عظمت و رفعت کا اعتراف ہم عصروں نے بھی کیا، اور آنے والے زمانے کی گرویدگی تو مسلم ہے۔

غالب کو اپنی فارسی دانی پر اس حد تک فخر تھا کہ وہ اپنے پیش رو برعظیم کے فارسی دانوں میں ماسوا امیر خسرو اور کسی حد تک فیضی کے کسی کو در خور اعتنا خیال نہ کرتے تھے۔ یہی باعث تھا کہ وہ اپنے فارسی کلام کے مقابلے میں اردو کلام کو ''بے رنگ من است'' کہتے رہے۔ لیکن آخر انہیں اپنے اس رویے میں بھی لچک پیدا کرنی پڑی۔ اردو خطوط کے بارے میں کچھ اس سے بھی زیادہ نازک معاملہ پیش آیا۔ برعظیم میں اسلامی عہد میں علما کی زبان فارسی رہی اور غالب کے زمانے تک، اردو کے پھیلاؤ کے باوصف، علما اپنی نگارشات کے لیے فارسی ہی کا سہارا لے رہے تھے۔ پھر غالب جیسے ذہن وفکر کا آدمی کیونکر یہ روش خاص چھوڑ کر سیدھی سادی اور عوامی زبان کو منہ لگا سکتا تھا۔ ایک عرصے تک وہ فارسی ہی میں مکتوب نگاری کرتے رہے اور اس زبان میں انشا پردازی کے جوہر دکھاتے رہے۔ پھر قدرتی طور پر ایک وقت ایسا آیا جب قویٰ جواب دینے لگے اور فرصت زندگی کم نظر آنے لگی۔ محنت مشقت کا وہ یارا نہ رہا جو فارسی تحریروں کو عالمانہ شان سے پیش کر سکے۔ اس لیے ضرورت نے سیدھی سادی روزمرہ اردو اختیار کرنے پر مجبور کیا۔ غالب نے ایک حقیقت

شناس اور معاملہ فہم انسان کی طرح اس تبدیلی سے بھی سمجھوتہ کرلیا۔ پھر جو روش مجبوری یا معذوری کے تحت اختیار کی گئی تھی، جب اس میں غالب کی جدت پسند ادبی شخصیت کا بے ساختہ اظہار ہونے لگا اور اس کی حسن و خوبی آشکار ہوئی، تو آخر عمر میں، جب شعری تخلیق کے سوتے خشک ہو چکے تھے، یہی روش ان کی تخلیقی صلاحیتوں کے اظہار کا سرچشمہ بن گئی۔ اس طرح شاعری کے علاوہ اردو نثر میں بھی غالب کی عظمت فن کا ایک اور روشن مینار تعمیر ہوا۔

غالب کے جو خطوط اس وقت تک سامنے آئے ہیں ان کے مطابق ان کی اردو خطوط نویسی کا آغاز مارچ ۱۸۴۸ء میں ہوا۔ پھر رفتہ رفتہ فارسی خطوط نویسی میں کمی اور اردو خطوط میں اضافہ ہوتا گیا۔ حتیٰ کہ ۱۸۶۱ء میں (خاتمہ پنج آہنگ کی تحریر سے دو سال قبل) فارسی میں خطوط لکھنے ترک کر دیے گئے۔ بعض لوگ فارسی میں خط لکھنے کا تقاضا کرتے تھے تو غالب معذرت کے ساتھ اردو میں خطوط نویسی کی وجوہ بتا دیتے تھے۔ مولوی نعمان احمد کے نام ایک خط (محررہ ۱۶ اکتوبر ۱۸۶۲ء) میں لکھتے ہیں:

''برسوں سے خطوط فارسی لکھنا چھوڑ دیے۔ اب شہزادہ بشیر الدین نبیرۂ ٹیپو سلطان مغفور کے سوا کسی کو فارسی خط نہیں لکھتا اور یہ موافق اُن کے حکم کے ہے اور وہ مطاع ہیں اور میں مطیع۔''

[خطوط غالب، مرتبہ مولانا مہر صفحہ ۲۵۱]

غالب کی اردو خطوط نویسی کی ابتدا کے بارے میں مختلف قیاس آرائیاں کی گئی ہیں۔ مولانا حالی نے قلعۂ معلیٰ کے تعلق (۱۸۵۰ء) اور مصروفیات کو وجہ قرار دیا ہے۔ لیکن ۱۸۴۸ء کے اردو خطوط اس موقف کی تردید کرتے ہیں۔ ہمارے خیال میں اس امر میں خود غالب کے بیانات زیادہ قابل لحاظ ہیں۔ ان بیانات سے اردو خطوط نویسی کی ابتدا کے علاوہ فارسی میں اظہار کی دقتوں اور اردو میں اظہار کی سہولتوں کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ اور پھر جب یہ باتیں غالب جیسا اپنی فارسی پر ناز کرنے والا شخص کہتا ہے تو اس سے یہ امر واضح ہوتا ہے کہ اکتسابی زبان بہر حال اکتسابی ہی ہوتی ہے۔ اس میں انسان خواہ کتنی ہی مہارت بہم پہنچالے، اسے فطری اور بلا تکلف طریق اظہار کا درجہ مشکل ہی سے حاصل ہو سکتا ہے۔ غالب کے وہ خطوط جن میں انہوں نے فارسی خطوط لکھنے کے

بارے میں معذوری کا اظہار اور پھر اس کی وجوہ بیان کی ہیں، اس مسئلے کو بہ خوبی حل کر دیتے ہیں۔ عمر کی ایک خاص منزل پر پہنچ کر ضعف و ناتوانی کا احساس اور فارسی میں انشا پردازی کا معیار قائم رکھنے کے لیے بہ تکلف عبارت آرائی اور اس کے لیے محنت پژوہی و جگر کاوی، یہ وہ بنیادی اسباب تھے جو غالب کو سادہ اردو خطوط نویسی پر مجبور کر دیتے ہیں۔ مثلاً:

''افسوس کہ میرا حال اور یہ لیل و نہار، آپ کی نظر میں نہیں، ورنہ آپ جانیں کہ اس بجھے ہوئے دل اور اس ٹوٹے ہوئے دل اور اس مرے ہوئے دل پر کیا کر رہا ہوں۔ نواب صاحب، اب نہ دل میں وہ طاقت، نہ قلم میں زور سخن گستری کا ایک ملکہ باقی ہے، بے تامل اور بے فکر جو خیال میں آ جائے وہ لکھ لوں، ورنہ فکر کی صعوبت کا تحمل نہیں ہو سکتا۔''

[خط بنام انورالدولہ شفق، خطوط غالب، صفحہ ۳۶۳]

''بارہ برس کی عمر سے نظم و نثر میں کاغذ مانند اپنے نامۂ اعمال کے سیاہ کر رہا ہوں۔ باسٹھ برس کی عمر ہوئی۔ پچاس برس اس شیوے کی ورزش میں گزرے۔ اب جسم و جاں میں تاب و تواں نہیں۔ نثر فارسی لکھنی یک قلم موقوف۔ اُردو۔ سو اس میں عبارت آرائی متروک۔ جو زبان پر آوے، وہ قلم سے نکلے۔ پانو رکاب میں ہے اور ہاتھ باگ پر، کیا لکھوں اور کیا کہوں؟''

[خط بنام میر غلام حسنین قدر بلگرامی، نگاشتہ بست و سوم فروری ۱۸۵۷ء]

''بندہ نواز، فارسی میں خطوں کا لکھنا پہلے سے متروک ہے۔ پیرانہ سری وضعف کے صدموں سے محنت پژوہی و جگر کاوی کی قوت مجھ میں نہیں رہی۔ حرارت غریزی کو زوال ہے اور یہ حال ہے:

مضمحل ہو گئے قویٰ غالب
وہ عناصر میں اعتدال کہاں

کچھ آپ ہی کی تخصیص نہیں، سب کو، جن سے خط و کتابت رہتی ہے، اُردو ہی میں نیاز نامے لکھا کرتا ہوں۔ جن جن صاحبوں کی خدمت میں آگے میں نے فارسی زبان میں خطوط و مکاتیب لکھے اور بھیجے تھے، اُن میں جو صاحب الی الآن ذی حیات و موجود ہیں،

اُن سے بھی عند الضرورت اسی زبان مروج میں مکاتبت و مراسلت کا اتفاق ہوا کرتا ہے۔ پارسی مکتوبوں، رسالوں، نسخوں اور کتابوں کے مجموع شیرازہ بستہ، چھاپا ہو کر اطراف واقصائے عجم میں پھیل گئے۔ حال کی نثروں کو کون فراہم کرنے جائے؟ جان کنی کے خیالات نے مجھ کو ان کی تحریر و تعلق و بار سے دست بردار و سبک دوش کر دیا۔ جو نثریں کہ مجموع و یک جا ہو کر جہاں جہاں منتشر ہو گئی ہیں اور آئندہ ہوں، انہیں کو جناب احدیت جلت عظمتہ مقبول قلوب اہل سخن و مطبوع طبائع ارباب فن فرمائے اور میں اب انتہائے عمر ناپائیدار کو پہنچ کر آفتاب لب بام اور بہجوم امراض جسمانی و آلام روحانی سے زندہ در گور ہوں۔ کچھ یاد خدا بھی چاہیے۔ نظم و نثر کے قلمرو کا انتظام ایزد دانا و توانا کی عنایت و اعانت سے خوب ہو چکا۔ اگر اس نے چاہا تو قیامت تک میرا نام و نشان باقی و قائم رہے گا۔ پس اُمیدوار ہوں کہ انہیں نذر محقر یعنی تحریرات روزمرہ اُردوئے سادہ و سرسری کو تا امکان غنیمت جان کر قبول فرماتے رہیں اور درویش دلریش وفرو ماندۂ کشاکش معاصی کے خاتمہ بخیر ہونے کی دعا مانگیں۔ اللہ بس ماسویٰ ہوس۔"

[خط بنام عبدالرزاق شاکر، خطوط غالب، صفحہ ۵۳۷]

غالب نے کاروباری اور معاملاتی ضرورتوں کے تحت اردو میں خطوط لکھنے شروع کیے اور سادگی سے مطلب نویسی پر مدار رکھا۔ رفتہ رفتہ ان خطوط میں، جو خاص احباب اور شاگردوں کو لکھے گئے، جذباتی عنصر اظہار و بیان کے حسین نقوش بنانے لگا۔ واقعۂ انقلاب (۱۸۵۷ء) سے پہلے غالب کے خطوط میں کاروباری معاملات کے علاوہ علمی مسائل اور ادبی خیالات کے اظہار نے اسلوب میں گونا گوں کیفیات پیدا کرنی شروع کر دی تھیں[1]۔ لیکن واقعۂ انقلاب کے بعد ان کے اردو خطوط میں ادبی لحاظ سے ایک عظیم تغیر پیدا ہوا، جس کے کچھ نفسیاتی محرکات تھے۔

---

(۱) مثلاً منشی ہرگوپال تفتہ کے نام غالب کے مندرجہ ذیل خطوط (بحوالہ خطوط غالب، ازمہر) قابل ذکر ہیں۔ نشان ۳ (جنوری ۱۸۵۲ء) نشان ۷ (جون ۱۸۵۲ء)، نشان ۸ (دسمبر ۱۸۵۲ء)، نشان ۱۳، نشان ۱۶، نشان ۱۸ (۲۱ اگست ۱۸۵۳ء)، نشان ۲۵ (۲ مارچ ۱۸۵۴ء)

واقعۂ انقلاب ایک ایسا حادثۂ عظیم تھا جس نے ملک کی اجتماعی زندگی کو بُری طرح متاثر کیا۔ انقلاب کے اسباب، واقعات اور اثرات تو تاریخ کا اہم حصہ ہیں لیکن غالب کی ذات پر اس کے جو اثرات پڑے وہ ادبی لحاظ سے بڑے دُوررس نتائج کے حامل تھے۔ غالب بقول حالی ایک حیوانِ ظریف تھے۔ اس نوع کا انسان مجلسی زندگی کا دلدادہ ہوتا ہے۔ غالب بھی ایک مجلس پسند انسان تھے۔ وہ کثیر الاحباب تھے۔ واقعۂ انقلاب نے اس مجلسی زندگی کو درہم برہم کر دیا۔ انگریزوں نے سقوطِ دہلی کے بعد مسلمانوں کو خاص طور پر نشانۂ انتقام بنایا اور انہیں شہر سے نکلنے پر مجبور کر دیا گیا، اور پھر ایک عرصے تک انہیں شہر بدر رکھا گیا[1]۔ غالب اس ابتلائے عام سے محفوظ اور

---

(۱) غالب کے بعض خطوط میں ان واقعات کے بارے میں اشارے ملتے ہیں۔

"۔۔یعنی ایک خط میں نے منشی نبی بخش صاحب کو بھیجا، اس کا جواب مجھ کو آیا اور ایک خط تمھارا کہ تم بھی موسوم بہ منشی ہرگوپال اور متخلص بہ تفتہ ہو، آج آیا اور میں جس شہر میں ہوں اس کا نام بھی دِلّی اور اس محلے کا نام بلی ماروں کا محلّہ ہے، لیکن ایک دوست اُس جنم کے دوستوں میں سے نہیں پایا جاتا۔ واللہ ڈھونڈنے کو مسلمان اس شہر میں نہیں ملتا۔ کیا امیر، کیا غریب، کیا اہلِ حرفہ، اگر کچھ ہیں تو باہر کے ہیں۔ ہنود البتہ کچھ کچھ آباد ہو گئے ہیں۔"

[خط بنام تفتہ، ۵ دسمبر ۱۸۵۷ء، خطوطِ غالب، صفحہ ۱۵۲]

"مسلمان آدمی شہر میں سڑک پر بن ٹکٹ پھر نہیں سکتا، ناچار تم کو خط نہ بھیج سکا۔"

[خط بنام تفتہ، ۵ مارچ ۱۸۵۸ء، خطوطِ غالب، صفحہ ۱۵۴]

"یہ بھی مشہور ہے کہ پانچ ہزار ٹکٹ چھاپے گئے ہیں۔ جو مسلمان شہر میں اقامت چاہے بقدرِ مقدور نذرانہ دے"۔

[خط بنام میر مہدی مجروح، ۲ فروری ۱۸۵۹ء، خطوطِ غالب، صفحہ ۲۸۱]

"اے میری جان! یہ وہ دِلّی نہیں، جس میں تم پیدا ہوئے ہو۔ وہ دِلّی نہیں جس میں تم نے علم تحصیل کیا۔ وہ دِلّی نہیں جس میں تم شعبان بیگ کی حویلی میں مجھ سے پڑھنے آیا کرتے تھے۔ وہ دِلّی نہیں جس میں اکیاون برس سے مقیم ہوں۔ ایک کیمپ ہے۔ مسلمان، اہلِ حرفہ یا حکام کے شاگرد پیشہ، باقی سراسر ہنود۔"

[خط بنام علاؤ الدین علائی، ۱۶ فروری ۱۸۶۲ء]

دہلی میں مقیم رہے!۔لیکن ان کے عزیز احباب ان سے بچھڑ گئے ۔غالب کے لیے یہ ایک طرح کی قید تنہائی تھی جس کا ان کے قلب و ذہن پر بڑا شدید اثر ہوا، اور وہ اس عالم تنہائی میں بڑی گھٹن اور بے بسی محسوس کرنے لگے ۔تنہائی کے اس تلخ احساس کو دُور کرنے کے لیے انہوں نے خطوط کا سہارا لیا۔ڈاک کا انتظام معقول ہو چکا تھا جس سے ان کے اس رجحان کو تقویت ہوئی ۔اس طرح غالب کی اردو خطوط نویسی کو ایک نئی فضا ملی ۔اگر پہلے یہ خط زیادہ تر کاروبار دنیوی اور معاملات ضروری کی خاطر لکھے جاتے تھے ،تو اب یہ خط کاروبار شوق اور تسکین دل کے لیے لکھے جانے لگے ،اور خطوط نگاری کے ذریعے اُس مجلسی خلا کو پُر کیا جانے لگا جو واقعۂ انقلاب سے پیدا ہوا تھا ۔اس لیے اب غالب کے خطوط محض نامہ نگاری کا وسیلہ نہیں رہے تھے بلکہ مجلس آرائی کا ذریعہ بن گئے تھے ۔تنہائی کی خاموش فضا میں احباب سے ملاقاتیں ہونے لگیں؟۔ یہ ملاقاتیں جسم وروح کی نہ سہی لیکن اس سے کچھ کم بھی نہ تھیں ۔ان ملاقاتوں نے خطوط غالب میں وہ ادبی محاسن پیدا کیے جن کی بدولت غالب کا ادبی مقام (خطوط کے آئینے میں) نہ صرف اردو ادبیات میں بلکہ عالمی ادبیات میں بہت اونچا نظر آتا ہے۔

---

(۱) غالب نے تفتہ کے نام ایک خط میں اس کی تفصیل بتائی ہے:

''اب پوچھو تو کیوں کر مسکن قدیم میں بیٹھا رہا؟ صاحب بندہ، میں حکیم محمد حسن خاں مرحوم کے مکان میں نو دس برس سے کرایہ کو رہتا ہوں اور یہاں قریب کیا دیوار بہ دیوار ہیں گھر حکیموں کے اور وہ نوکر ہیں راجا نرندر سنگھ بہادر والی پٹیالہ کے ،راجا صاحب نے صاحبان عالی شان سے عہد لیا تھا کہ بر وقت غارت دہلی یہ لوگ بچے رہیں ۔چنانچہ بعد فتح راجا کے سپاہی یہاں آ بیٹھے اور یہ کوچہ محفوظ رہا ۔ورنہ میں کہاں اور یہ شہر کہاں؟'' [خطوط غالب ،از مہر ،صفحہ ۱۵۲]

(۲)''انصاف کرو ،کتنا کثیر الاحباب آدمی تھا ۔کوئی وقت ایسا نہ تھا میرے پاس دو چار دوست نہ ہوتے ہوں''۔ [خطوط غالب ،مرتبہ مہر ،صفحہ ۱۵۹]

''دو ایک دن کے بعد جب جی باتیں کرنے کو چاہے گا ،تب اُن کو خط لکھوں گا۔'' [خطوط غالب ،صفحہ ۱۶۰]

''بھائی ،مجھ میں تم میں نامہ نگاری کا ہے کو ہے ،مکالمہ ہے۔'' [ایضاً 'صفحہ ۱۷۱]

''تم سمجھے؟ میں تمھارے ،منشی نبی بخش صاحب اور جناب مرزا حاتم علی صاحب کے خطوط کے آنے کو تمھارا اور ان کا آنا سمجھتا ہوں ۔تحریر گویا وہ مکالمہ ہے جو باہم ہوا کرتا ہے۔'' [ایضاً 'صفحہ ۱۷۴]

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

مجلسی فضا میں بےتکلف احباب کی جو غیر رسمی ملاقاتیں شب و روز ہوتی ہیں، وہ انسانی زندگی کی متاعِ عزیز ہیں۔ ان ملاقاتوں میں احوالِ دل سے لے کر کوائفِ روزگار تک ہر موضوع پر باتیں ہوتی ہیں۔ اپنی کہی جاتی ہے، دوسرے کی سُنی جاتی ہے۔ اس طرح دل کا بوجھ بہت حد تک ہلکا ہو جاتا ہے۔ آلامِ روزگار کو سہنا نسبتاً آسان ہو جاتا ہے۔ پھر انسان کی زندگی پر ایک وقت ایسا بھی آتا ہے جب وہ اپنی عمرِ رفتہ کے بیتے ہوئے لمحوں پر نظر ڈالتا ہے تو ایک خواب و خیال کی طرح رُودادِ حیات کی مختلف کڑیاں نظروں کے سامنے آنے لگتی ہیں۔ اُس وقت انسان میں اپنی زندگی کے مشاہدوں اور تجربوں کو دوسروں تک منتقل کرنے کی فطری خواہش پیدا ہوتی ہے۔ آپ بیتی یا خودنوشت سوانحِ عمری لکھنے کا رجحان بھی عام طور پر اُس دَور میں پیدا ہوتا ہے جب انسان شباب و شیب کی وادیوں سے گزر کر کہولت کی منزل میں قدم رکھتا ہے۔ آپ بیتی سنانے کی یہ فطری خواہش مجلسی ماحول ہی میں پوری ہو سکتی ہے۔ غالب کی اُردو خطوط نویسی کا سلسلہ بھی زندگی کے اسی مرحلے میں شروع ہوا۔ واقعۂ انقلاب کے بعد انہوں نے مجلسی ماحول سے محرومی کا مداوا خطوط سے کیا۔ ان محرکات نے اُن کے خطوط میں مراسلہ نگاری اور مکالمہ نگاری کے فاصلوں کو ختم کر دیا۔ وہ اپنے خطوط میں جو فضا قائم کرتے ہیں، اُس میں وہی کیفیات ملتی ہیں جو اس قسم کی شبانہ محفلوں میں عام طور پر ہوتی ہیں۔ خبریں سنانا، خبروں پر تبصرے، باتیں کرنا، مکالمے، شکوے شکایتیں، ماحول کی مرقع کشی، زندہ دلی کی فضا پیدا کرنے کے لیے لطیفے اور بذلہ سنجی، زندگی کی آرزوؤں اور تمناؤں کا اظہار، آرزوؤں کی شکست و ریخت سے پیدا ہونے والے غم سے خود نباہ کرنا اور دوسروں کو بھی حوصلہ دلانا، غالب کے خطوط کی اہم خصوصیات ہیں اور انہی خصوصیات کے فن کارانہ اظہار نے اُن کے خطوط میں ادبی محاسن کو اُجاگر کیا ہے، جس کی تفصیل آگے آتی ہے۔

''میں اس تنہائی میں صرف خطوں کے بھروسے جیتا ہوں۔ یعنی جس کا خط آیا، میں نے جانا کہ وہ شخص تشریف لایا''

[ایضاً، صفحہ ۱۷۹]

''مرزا صاحب، میں نے وہ اندازِ تحریر ایجاد کیا ہے کہ مراسلہ کو مکالمہ بنا دیا ہے۔ ہزار کوس سے بہ زبانِ قلم باتیں کیا کرو، ہجر میں وصال کے مزے لیا کرو۔''

[ایضاً، صفحہ ۲۲۷]

''بھائی، مجھ کو اس مصیبت میں کیا ہنسی آتی ہے کہ ہم تم اور مرزا تفتہ میں مراسلت و مکالمت ہو گئی ہے۔ روز باتیں کرتے ہیں۔''

[ایضاً، صفحہ ۲۷۰]

خطوط غالب کے فنی و ادبی محاسن کا جائزہ لیتے ہوئے اس امر کو بہر حال ملحوظ رکھنا ضروری ہے کہ غالب خط کو خط سمجھ کر ہی لکھ رہے تھے، اسے داستان، آپ بیتی، انشائیہ، افسانہ یا ڈراما سمجھ کر نہیں لکھ رہے تھے۔ اس لیے اُن کے خطوط میں کاروباری اور معاملاتی امور بھی ہوتے ہیں اور علمی مسائل پر بحثیں بھی ملتی ہیں۔ خطوط کے اس حصے کو ادبی محاسن کے اعتبار سے نہیں بلکہ اُسلوب نگارش کے اس پہلو سے دیکھا جا سکتا ہے کہ غالب نے ان مسائل و معاملات کے بیان میں سادہ و سلیس نثر کے عمدہ نمونے پیش کیے ہیں۔ قافیوں کا استعمال، جو خطوط غالب کی ایک اہم خصوصیت ہے، اس قسم کے موقعوں پر عموماً نہیں ہوتا۔ اس لیے اس حصے کو ہم علمی نثر کہہ سکتے ہیں۔

دوسری بات جو اس جائزے کے سلسلے میں قابل توجہ ہے، وہ یہ ہے کہ غالب کے خطوط مختلف اصحاب کے نام لکھے گئے۔ اصولاً خط کی تحریر و ترسیل میں مکتوب نگار اور مکتوب الیہ کے درمیان تعلقات کی نوعیت بنیادی حیثیت رکھتی ہے۔ اسی سے خط کا لب و لہجہ آغاز سے اختتام تک متعین ہوتا ہے۔ جذباتی عنصر عام طور پر انہی خطوط میں مل سکتا ہے، جو ایسے اشخاص کو لکھے جاتے ہیں جن کے ساتھ انسان بے تکلفی سے دل کی بات کر سکتا ہے۔ ادبی لحاظ سے غالب کے وہ خطوط زیادہ اہم ہیں، جو بے تکلف احباب اور عزیز ترین شاگردوں کو لکھے گئے۔

القاب وآداب:

غالب نے خطوط نویسی کے قدیم انداز کو، جسے وہ ''محمد شاہی روشیں'' کہہ کر پکارتے ہیں، یکسر بدل دیا۔ اس تبدیلی کا احساس خطوط غالب کے آغاز میں القاب وآداب کے استعمال ہی سے ہو جاتا ہے۔ غالب اس بارے میں انورالدولہ شفق کو لکھتے ہیں:

''پیر و مرشد، یہ خط لکھنا نہیں ہے باتیں کرنی ہیں اور یہی سبب ہے کہ میں القاب وآداب نہیں لکھتا۔''

[خطوط غالب، مرتبہ مہر، صفحہ ۳۶۲]

مکتوب نگاری کا جو نیا انداز غالب نے اختیار کیا تھا اُس میں رسمی القاب وآداب کی گنجائش ہی نہیں تھی۔ تاہم غالب نے فرق مراتب کو بہر حال ملحوظ رکھا ہے۔ اس کا اندازہ مختلف مکتوب الیہوں کے نام خطوط کے مطالعہ سے ہو جاتا ہے۔ القاب میں بے تکلفی اور ندرت وہیں تک ہے جہاں مراسم

کی نوعیت اس کی جازت دیتی ہے۔ جہاں ادب واحترام واجب ہوتا ہے، وہاں القاب میں کلمات احترام آجاتے ہیں۔مثلاً خواجہ غلام غوث خاں بے خبر کے نام خطوط میں: پیرومرشد، قبلہ، قبلہ حاجات، جناب عالی، حضور، حضرت پیرومرشد، بندہ پرور وغیرہ، انورالدولہ شفق کے نام خطوط میں: پیرومرشد، قبلہ و کعبہ، خداوندنعمت، جناب بھائی صاحب قبلہ، نواب امین الدین احمد خاں کے لیے برادر صاحب جمیل المناقب عمیم الاحسان وغیرہ، اور جہاں تعلقات میں زیادہ یگانگت نہیں ہوتی وہاں القابات میں بھی رکھ رکھاؤ ہوتا ہے۔مثلاً حضرت، مخدوم ومکرم، جناب عالی، صاحب وغیرہ۔اب ذرا بے تکلف احباب اور شاگردوں کے نام خطوط میں القابات کی جدت وندرت ملاحظہ فرمایئے:

علاؤالدین احمد خاں علائی:

''میرزا تسیمی کو دعا پہنچے، صاحب، مولانا نسیمی، میری جان، میری جان علائی ہمہ دان، جان غالب، علائی مولائی، مرزا علائی، یار بھتیجے گویا بھائی مولانا علائی! خدا کی دہائی، میاں، اقبال نشانا، جانا عالی شانا، جانا جانا، اے میری جان، اجی مولانا علائی وغیرہ۔''

منشی ہرگوپال تفتہ:

مہاراج، بھائی، شفیق بالتحقیق منشی ہرگوپال تفتہ سلامت رہیں، بندہ پرور، کاشانۂ دل کے ماہ دو ہفتہ منشی ہرگوپال تفتہ، صاحب، منشی صاحب، جان من و جانان من، میرزا تفتہ، نور نظر و لخت جگر مرزا تفتہ، برخوردار مشفق میرے کرم فرما میرے اجی مرزا تفتہ کیوں صاحب، دیکھو صاحب، میاں، میری جان، برخوردار مرزا تفتہ، میاں مرزا تفتہ، صاحب بندہ، حضرت، نورچشم غالب، از خود رفتہ مرزا تفتہ، آؤ مرزا تفتہ میرے گلے لگ جاؤ اور میری حقیقت سنو، میرے مہربان، میری جان میرزا تفتہ سخندان (بیشتر خطوط بغیر القاب کے شروع ہوتے ہیں)۔

مرزا حاتم علی بیگ مہر:

بندہ پرور، صاحب میرے، بھائی صاحب، بندہ پرور، شفیق بالتحقیق مولانا مہر ذرہ بے مقدار کا سلام قبول کریں ہمرزا صاحب۔

میر مہدی مجروح:

میاں، صاحب، کیوں یار کیا کہتے ہو؟ سید صاحب، بھائی، میری جان، میر مہدی، میاں لڑکے، آہاہاہا! میرا پیارا میر مہدی آیا، جان غالب، لو صاحب، او میاں سید زادۂ آزادہ وتی کے عاشق دلدادہ، جو بائے حال دہلی والو سلام لو، نور چشم میر مہدی، آیئے جناب میر مہدی صاحب دہلوی بہت دنوں میں آئے۔ کہاں تھے؟ برخوردار کامگار میر مہدی۔

باتیں کرنا، مکالمے، خبریں سنانا:

القاب و آداب کی اس بے تکلفی کے ساتھ ہی دوسرا اہم پہلو، جس نے خطوط غالب کو ادبی لحاظ سے دلکش و دلچسپ بنایا ہے، وہ باتیں کرنے کا انداز ہے۔ ہم اس کے نفسیاتی محرکات پر پہلے گفتگو کر آئے ہیں۔ ادبی اسلوب میں باتوں کے انداز میں جو اپنایت، یگانگت اور بے تکلفی ہوتی ہے، وہ کسی اور انداز بیان میں نہیں ہوتی۔ میر تقی میر کو بھی اپنے اس انداز خاص کی دلکشی کا پورا احساس تھا:

باتیں ہماری یاد رہیں پھر باتیں ایسی نہ سنیے گا
پڑھتے کسی کو سنیے گا تو دیر تلک سر دُھنیے گا

غالب خطوط کے ذریعے جس مجلسی ماحول کو پیدا کرنا چاہتے تھے، وہ اسی انداز نگارش سے ممکن تھا۔ انہوں نے آئین نامہ نگاری چھوڑ کر مراسلے کو مکالے کی جو صورت دی اُس میں مکالمے (Dialogue) بھی ہیں اور بات چیت کی مجلسی کیفیت بھی:

''بھائی صاحب کا خط کئی دن ہوئے کہ آیا ہے اور میرے خط کے جواب میں ہے۔ دو ایک دن کے بعد جب جی باتیں کرنے کو چاہے گا، تب اُن کو خط لکھوں گا۔''

[خطوط غالب، مرتبہ مولانا مہر، صفحہ ۱۶۰]

''اس وقت تمھارا ایک خط اور یوسف مرزا کا ایک خط آیا۔ مجھے باتیں کرنے کا مزا ملا تو دونوں کا جواب ابھی لکھ کر روانہ کیا۔ اب میں روٹی کھانے جاتا ہوں۔''

[خطوط غالب، مرتبہ مولانا مہر، صفحہ ۲۸۶]

''اب میں حضرت سے باتیں کر چکا۔ خط کو سر نامہ کر کے کہار کو دیتا ہوں کہ ڈاک میں دے آوے''   [ایضاً--صفحہ۳۶۱]

''اس وقت جی تم سے باتیں کرنے کو چاہا، جو کچھ دل میں تھا وہ تم سے کہا، زیادہ کیا لکھوں۔''

[ایضاً-صفحہ۳۸۱]

باتیں کرنے کے اس انداز سے نثر میں زندگی کا احساس بیدار ہوتا ہے اور پڑھنے والا یہ محسوس کرتا ہے کہ وہ کسی جیتے جاگتے ماحول میں بیٹھا ہے جہاں احباب باہم گر مصروف گفتگو ہیں۔ اس میں حرف وحکایت بھی ہے اور شکوہ وشکایت بھی۔ باتیں کرنے اور سننے والے کے درمیان اتنا قرب ہوتا ہے کہ وہ باتوں کے علاوہ ایک دوسرے کے دل کی دھڑکنیں بھی سن سکتے ہیں۔ اسلوب میں اس انداز سے باہمی اعتماد اور رفاقت کی جو فضا پیدا ہوتی ہے اُس میں معمولی سے لے کر غیر معمولی باتوں تک یکساں توجہ سے سنی جاتی ہیں اور انسان اُن میں لطف لینے لگتا ہے۔ اسلوب کا یہی انداز ہے جو انشائیہ نگاری (Essay) کے لیے نہایت ضروری ہوتا ہے۔ اردو میں انشائیہ کی صنف غالب کے بعد سر سید کے زمانے میں ''تہذیب الاخلاق'' کے اجراء سے ظہور میں آئی۔ لیکن اس صنف ادب کے لیے غالب کے اسلوب گفتگو نے زمین پہلے ہموار کر دی تھی۔

غالب نے اپنے بعض خطوط میں گفتگو کو مزید جاندار اور پُر لطف بنانے کے لیے مکالموں کو بھی جگہ دی ہے۔ غالب کے مکالمے بڑے مختصر اور برجستہ ہوتے ہیں اور جو بات بیانیہ یا وضاحتی انداز میں ذرا طویل اور بے کیف ہو سکتی تھی، وہ مکالموں میں بڑی مختصر، جامع اور دلکش بن گئی ہے۔ بعض مکالموں نے تو ایسا سماں پیدا کر دیا ہے کہ اُن کی وجہ سے متعلقہ خطوط ادبی لحاظ سے ضرب المثل بن گئے ہیں۔ مثلاً:

(۱) (غالب): کوئی ہے؟ ذرا یوسف مرزا کو بلائیو!

(؟): لو صاحب، وہ آئے!

(غالب): میاں، میں نے کل خط تم کو بھیجا ہے، مگر تمھارے ایک سوال کا جواب رہ گیا ہے، اب سن لو!

[خط بنام یوسف مرزا، خطوط غالب، صفحہ۴۰۴]

(۲) (غالب): بھئی محمد علی بیگ، لوہارو کی سواریاں روانہ ہوگئیں؟
(محمد علی): حضرت، ابھی نہیں!
(غالب): کیا آج نہ جائیں گی؟
(محمد علی): آج ضرور جائیں گی، تیاری ہو رہی ہے!
[خط بنام علاء الدین علائی، خطوط غالب، صفحہ ۶۹]

(۳) (غالب): تم خوب ہو!
(پیر جی): کیا کہنا!
(غالب): کس کا؟
(پیر جی): مرزا شمشاد علی بیگ کا!
(غالب): اس، اور کسی کا نام تم کیوں نہیں لیتے؟ دیکھو یوسف علی خاں بیٹھے ہیں، ہیرا سنگھ موجود ہے۔
(پیر جی): واہ صاحب! مَیں کیا خوشامدی ہوں جو منہ دیکھی کہوں؟ میرا شیوہ حفظ الغیب ہے۔ غیب کی تعریف کرنی کیا عیب ہے!
(غالب): ہاں صاحب، آپ ایسے ہی وضعدار ہیں، اس میں کیا ریب ہے!
[خط بنام علاالدین خان علائی، خطوط غالب، صفحہ ۹۱]

اور غالب کا شاہکار مکالمہ تو مندرجہ ذیل ہے جس میں مکتوب الیہ میر مہدی مجروح ہیں لیکن مکالمہ میرن صاحب سے ہو رہا ہے۔ کتنا برجستہ، لطیف اور دلچسپ انداز ہے:

(۴) (غالب): اے میرن صاحب، السلام علیکم!
(میرن): حضرت آداب!
(غالب): کہو صاحب، آج اجازت ہے، میر مہدی کے خط کا جواب لکھنے کی؟
(میرن): حضور مَیں کیا منع کرتا ہوں؟ مَیں نے عرض کیا تھا کہ اب وہ تندرست ہو گئے ہیں۔ بخار جاتا رہا ہے، صرف پیچش باقی ہے۔ وہ بھی رفع ہو جائے گی۔ مَیں اپنے ہر خط میں آپ کی طرف سے دعا لکھ

دیتا ہوں۔آپ پھر تکلیف کیوں کریں؟

(غالب): نہیں، میرن صاحب! اُس کے خط کو آئے ہوئے بہت دن ہوئے ہیں۔وہ خفا ہوا ہوگا۔جواب لکھنا ضرور ہے۔

(میرن): حضرت، وہ آپ کے فرزند ہیں، آپ سے خفا کیا ہوں گے۔

(غالب): بھائی، آخر کوئی وجہ تو بتاؤ کہ تم مجھے خط لکھنے سے کیوں باز رکھتے ہو؟

(میرن): سبحان اللہ، اے لو حضرت، آپ تو خط نہیں لکھتے اور مجھے فرماتے ہیں کہ تو باز رکھتا ہے۔

(غالب): اچھا، تم باز نہیں رکھتے، مگر یہ تو کہو کہ تم کیوں نہیں چاہتے کہ میں میر مہدی کو خط لکھوں؟

(میرن): کیا عرض کروں، سچ تو یہ ہے کہ جب آپ کا خط جاتا اور وہ پڑھا جاتا تو مَیں سنتا اور حظ اُٹھاتا۔اب جو مَیں وہاں نہیں ہوں تو نہیں چاہتا کہ تمھارا خط جاوے۔مَیں پنجشنبہ کو روانہ ہوتا ہوں۔میری روانگی کے تین دن بعد آپ خط شوق سے لکھیے گا۔

(غالب): میاں، بیٹھو، ہوش کی خبر لو۔تمھارے جانے نہ جانے سے مجھے کیا علاقہ؟ مَیں بوڑھا آدمی، بھولا آدمی، تمھاری باتوں میں آ گیا اور آج تک اُسے خط نہیں لکھا۔لاحول ولا قوۃ۔۔۔۔"

اردو کے افسانوی ادب میں ناول اور ڈرامے کی اصناف بھی غالب کے بعد ظہور میں آئیں۔لیکن خطوط غالب کے یہ پیرایہ ہائے بیان ان اصناف ادب کے لیے اظہار و بیان کی راہیں تیار کر گئے۔

مکالموں کے علاوہ باتوں کے ساتھ ساتھ مجلسی زندگی کا ایک اہم پہلو خبریں سنانے کا ہے۔خبریں اور خبروں پر تبصرے ایک معاشرتی جبلت ہے جس کی تکمیل احباب کی شبانہ مجلسوں میں ہوتی ہے۔غالب نے بھی اس کے ذریعے مجلسی فضا پیدا کر کے اپنی اور احباب کی تسکین دل کا سامان پیدا کیا ہے:

''آج شہر کے اخبار لکھتا ہوں، سوانح لیل و نہار لکھتا ہوں''

[خطوط غالب، صفحہ ۵۷]

''ہم تمھارے اخبار نویس ہیں اور تم کو خبر دیتے ہیں کہ.....''

[ایضاً صفحہ ۱۸۳]

''میاں لڑکے! کہاں پھر رہے ہو؟ اِدھر آؤ خبریں سنو!''

[ایضاً صفحہ ۲۹۵]

خبریں سننے سنانے کی اس معاشرتی حس نے جہاں غالب کے خطوط میں مجلسی رنگ کو اور نمایاں کر دیا ہے، وہاں ان کے خطوط تاریخی لحاظ سے بھی بہت اہم دستاویز بن گئے ہیں۔ غالب نہ صحافی تھے نہ مورخ، لیکن وہ احباب کی خاطر وقائع نویس بھی بنے اور صحیفہ نگار بھی، اور اس طرح اپنے خطوط میں عصری تاریخ کا بہت سا قیمتی مواد چھوڑ گئے۔ غالب نے ایک نہایت اہم اور ہنگامہ خیز دور میں اپنے احباب کو خطوط لکھے۔ انقلاب ۱۸۵۷ء کے بعد شہر بدر احباب کے تقاضوں کے تحت انھیں ''سوانح لیل و نہار'' بھی لکھنے پڑے۔ قدرتی طور پر وہ خطوط میں اپنے گرد و پیش کے ماحول کی بعض ایسی تفصیلات بھی پیش کر جاتے ہیں جو کسی اور ذریعے سے ہم تک نہیں پہنچ سکتی تھیں۔ وہ واقعات و حالات ہی بیان نہیں کرتے بلکہ ردعمل اور تاثرات بھی قلم بند کر جاتے ہیں۔ اس طرح غالب کے خطوط کا یہ سرمایہ رپورتاژ کی ذیل میں آجاتا ہے جسے ادب میں اب ایک الگ صنف کا درجہ حاصل ہو گیا ہے۔

خطوط غالب میں بیان کردہ معاصر واقعات و حالات کی تصدیق دوسرے ذرائع سے کر کے ان کی تاریخی حیثیت متعین کی جا سکتی ہے۔ غالب تک اطلاعات یا خبریں مختلف ذرائع سے پہنچتی تھیں۔ وہ ان کا عقلی تجزیہ بھی ضرور کرتے ہوں گے۔ خبر اور افواہ میں فرق ان کے پیش نظر رہتا ہے:

''خلق نے از روئے قیاس، جیسا کہ دلّی کے خبر تراشوں کا دستور ہے، یہ بات اُڑا دی، سو سارے شہر میں مشہور ہے کہ.....''

[خطوط غالب، صفحہ ۲۸۰]

اس طرح غالب نے اپنے خطوط میں اپنے عہد کی زندگی کی بہت سی جھلکیاں دکھائی ہیں۔ جزئیات نگاری کی وجہ سے وہ بعض معمولی معمولی امور کا تذکرہ بھی کر جاتے ہیں۔ یہی معمولی باتیں آج کے محقق کو اُس دَور کی عمرانی زندگی کے بعید گوشوں کو سمجھنے میں مدد دیتی ہیں۔ دلی کی بربادی اور پھر اس کی بتدریج آبادی کے کوائف، خاص و عام کی گزر اوقات، معاشی حالات، سفر کے ذرائع اور حالات، ڈاک کے انتظامات، موسمی تغیرات وغیرہ [۱] یہ مختلف امور ہیں جو خطوط کی مجلسی فضا سے اُبھر کر اس عہد کی زندگی کی عکاسی کرتے ہیں۔

منظر نگاری اور مرقع کشی:

غالب خط لکھتے وقت نہ صرف اپنے لیے بلکہ مکتوب الیہ کے لیے بھی مجلسی فضا تخلیق کرنے کا پورا اہتمام کرتے ہیں۔ ماحول کا تاثر دینے کے لیے خط کے شروع یا اختتام پر غالب گرد و پیش کے منظر کی ایسی جزئیات پیش کرتے ہیں کہ مکتوب الیہ اور قاری کی نگاہوں کے سامنے اس فضا کا دلکش مرقع ابھرنے لگتا ہے۔ ادب میں مرقع کشی کے لیے بڑے سلیقے اور ہنرمندی کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایسی حقیقی جزئیات جو کسی موقع کی صورت حال کو اُجاگر کر سکیں اور پھر ان جزئیات میں ایسی ترتیب کہ کوئی بات زائد از ضرورت محسوس نہ ہو، بلکہ ہر معمولی اور غیر معمولی چیز حسن ترتیب سے یکجا ہو کر ایک مجموعی کیفیت پیدا کر دے، ایک ادبی مرقعے کی بنیادی شرائط ہیں۔ مرقع کشی کے لیے تخیل سے زیادہ مشاہدے کی ضرورت ہوتی ہے۔ مرقع وہی کامیاب ہوتا ہے جس میں خارجی ماحول کی خیالی باتیں نہ ہوں بلکہ حقیقی جزئیات ہوں۔ غالب کے خطوط میں منظر کشی اور مرقع نگاری اس لحاظ سے بڑی جاندار ہے کہ وہ ماحول کی خیالی تصویروں کے بجائے حقیقی

---

(۱) شاگرد میر مہدی مجروح کے نام ایک خط میں یہ تفصیلات ملاحظہ فرمائیے:

"پنشن سب کو سراسر ششماہی ملنے کا حکم ہوگیا۔ ہر مہینے میں سودی لو اور کھاؤ۔ کشمیری کٹرا بگڑ گیا ہے۔ ہائے! وہ اونچے اونچے در اور وہ بڑی بڑی کوٹھریاں دو رویہ نظر نہیں آتیں کہ کیا ہوئیں۔ آہنی سڑک کا آنا اور اس کی رہگور کا صاف ہونا ہنوز ملتوی ہے۔ چار دن سے پُروا ہوا چلتی ہے۔ ابر آتے ہیں، مگر صاف چھڑکاؤ ہوتا ہے۔ مینہ نہیں برستا۔ گیہوں، چنا، باجرہ تینوں اناج ایک بھاؤ ہیں۔ نو سیر ساڑھے نو سیر "

(صبح چہار شنبہ، نہم جنوری ۱۸۶۱ع، خطوط غالب، صفحہ ۲۹۹)

تصویریں پیش کرتے ہیں۔ وہ حسن انتخاب اور حسن ترتیب سے اپنے گردوپیش کی جزئیات سے ایسے مرقعے تیار کرتے ہیں جنھیں پڑھ کر قاری اس ماحول کا پورا احساس کرنے اور محظوظ ہونے لگتا ہے۔ مثلاً یہ مناظر اور مواقع دیکھیے !

(۱) ''رات کو خوب مینہ برسا ہے، صبح کو تھم گیا ہے۔ ہوا سرد چل رہی ہے۔ ابر تنک چھا رہا ہے۔ یقین ہے کہ تمھاری جدہ ماجدہ مع اپنی بہو اور پوتے کے روانہ لوہارو ہوں۔ کل آج کی روانگی کی خبر تھی۔ یہ لڑکا سعید ازلی ہے۔ ابر کا محیط ہونا اور ہوا کا سرد ہو جانا خاص اس کی آسائش کے واسطے ہے۔ میرا منتظر سر راہ ہے۔''

[خطوط غالب، بمرتبہ مہر، صفحہ ۶۸، ۶۹]

''ہاپوڑ کو روانہ ہوا۔ دونوں برخوردار گھوڑوں پر سوار پہلے چل دیے۔ چار گھڑی دن رہے میں ہاپوڑ کی سرائے میں پہنچا۔ دونوں بھائیوں کو بیٹھے ہوئے اور گھوڑوں کو ٹہلتے ہوئے پایا۔ گھڑی بھر دن رہے قافلہ آیا۔ میں نے چھٹانک بھر گھی داغ کیا۔ دو شامی کباب اس میں ڈال دیے۔ رات ہو گئی تھی شراب پی، کباب کھائے۔ لڑکوں نے ادہر کی کھچڑی پکوائی۔ خوب گھی ڈال کر آپ بھی کھائی اور سب آدمیوں کو بھی کھلائی''

[خطوط غالب، صفحہ ۱۱۷]

''میر مہدی صاحب، صبح کا وقت ہے، جاڑا خوب پڑ رہا ہے۔ انگیٹھی سامنے رکھی ہے۔ دو حرف لکھتا ہوں، ہاتھ تاپتا جاتا ہوں، آگ میں گرمی سہی، مگر ہائے وہ آتش سیال کہاں؟''

[خطوط غالب، صفحہ ۲۹۳]

''اہاہا! میرا پیارا میر مہدی آیا۔ آؤ بھائی مزاج تو اچھا ہے؟ بیٹھو، یہ رامپور ہے، دارالسرور ہے۔ جو لطف یہاں ہے وہ اور کہاں ہے؟ پانی، سبحان اللہ! شہر سے تین سو قدم پر ایک دریا ہے اور کوسی اس کا نام ہے۔ بے شبہ چشمۂ آب حیات کی کوئی سوت اس میں ملی ہے۔''

[خطوط غالب، صفحہ ۲۹۵]

''کوٹھری میں بیٹھا ہوں ٹٹی لگی ہوئی ہے۔ ہوا آ رہی ہے۔ پانی کا جھجر دھرا ہے۔ حقہ پی رہا ہوں، یہ خط لکھ رہا ہوں۔ تم سے باتیں کرنے کو جی چاہا، یہ باتیں کر لیں۔''

[خطوط غالب، صفحہ ۲۹۷]

(باقی حاشیہ اگلے صفحے پر)

آپ بیتی:

غالب کے سوانح حیات کے سلسلے میں حالی کی یادگار سے لے کر موجودہ زمانے تک بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور لکھا جا رہا ہے۔ حیاتِ غالب کے مصادر میں ان کے خطوط کی بڑی اہمیت ہے۔ صرف اس لیے نہیں کہ خطوط میں ان کے بارے میں بہت سی باتیں مل جاتی ہیں، بلکہ اس لیے کہ غالب نے اپنے خطوط میں آپ بیتی کے انداز میں خود اپنی سرگزشت کے بہت سے اوراق پیش کر دیے ہیں۔ آپ بیتی سوانح عمری کی وہ شاخ ہے جس کا موضوع لکھنے والے کی اپنی زندگی کے لیل و نہار ہوتا ہے۔ ہم پہلے عرض کر آئے ہیں کہ انسانی زندگی میں ایک ایسا مقام بھی آتا ہے جب انسان کے دل میں فطری طور پر کچھ اپنے بارے میں، گزری ہوئی زندگی کے تجربات و مشاہدات کی روشنی میں، کہنے کی خواہش پیدا ہوتی ہے۔ مہد سے لے کر لحد تک تو سوانح نگار ہی جا سکتا ہے۔ تاہم آپ بیتی نگار بھی اپنی روداد حیات اور ذہنی و جذباتی کیفیات اس وقت تک بیان کر سکتا ہے جب تک دم میں دم ہوتا ہے اور دست و قلم بالکل شل نہیں ہو جاتے:

لکھتے رہے جنوں کی حکایاتِ خوں چکاں
ہر چند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے

غالب باقاعدہ آپ بیتی یا سرگزشت نہیں لکھ رہے تھے، صرف احباب کے نام خط لکھ رہے تھے۔ البتہ یہ خطوط جس مجلسی ماحول کی بازیافت کے لیے لکھے جا رہے تھے اس میں دیگر احوال و کوائف کے علاوہ مجلسی زندگی کا یہ رجحان بھی پیدا ہوا کہ مکتوب نگار اپنے احباب کے سامنے اپنی بیتی زندگی کے تجربات و مشاہدات کی جھلک بھی پیش کرے۔ چنانچہ غالب نے مختلف خطوط میں اپنے بارے میں اتنا کچھ لکھ دیا ہے، اور اس انداز سے لکھا ہے کہ اگر اس مواد کو سلیقے سے ترتیب دیا جائے تو اس سے غالب کی ایک آپ بیتی تیار ہو جاتی ہے (جیسا کہ بعض حضرات نے اس سلسلے

"برسات کا حال نہ پوچھو، خدا کا قہر ہے۔ قاسم جان کی گلی سعادت خان کی نہر ہے۔ میں جس مکان میں رہتا ہوں، عالم بیگ خاں کے کٹرے کی طرف کا دروازہ گر گیا۔ مسجد کی طرف کے دالان کو جاتے ہوئے جو دروازہ تھا گر گیا۔ سیڑھیاں گرا چاہتی ہیں۔ صبح کے بیٹھنے کا حجرہ جھک رہا ہے۔ چھتیں چھلنی ہو گئی ہیں۔ مینہ گھڑی بھر برسے تو چھت گھنٹہ بھر برسے۔"

[خطوط غالب، صفحہ ۳۱۴]

میں کوشش بھی کی ہے)۔ اس آپ بیتی میں جیتا جاگتا غالب، اپنے غموں اور خوشیوں، اپنی آرزوؤں اور خواہشوں، اپنی محرومیوں اور شکستوں، اپنی احتیاجوں اور ضرورتوں، اپنی شوخیوں اور بذلہ سنجیوں کے ساتھ زندگی سے ہر صورت میں نباہ کرتا ہوا ملے گا:

تاب لائے ہی بنے گی غالب
واقعہ سخت ہے اور جان عزیز

یہ اوراق سرگزشت ایک ایسی شخصیت کے ہیں جو انا کا شدید احساس رکھنے کے باوجود اپنی احتیاجوں، اپنی کمزوریوں اور اپنی بدحواسیوں کا احتساب بھی کرسکتی ہے اور ان کا اظہار بھی ا۔ آپ بیتی کا یہ وہ نازک مقام ہے جو تلوار کی دھار سے بھی زیادہ تیز ہوتا ہے۔

غالب اپنے خطوط میں مرتے دم تک اپنی ذہنی کیفیات کے نقشے اور بیتی ہوئی زندگی

(ا) مثلاً قربان علی بیگ سالک کے نام خط میں یہ انداز ملاحظہ فرمایئے۔ خود احتسابی کی اس سے بہتر مثال ادب میں ملنی مشکل ہے:

''اپنا آپ تماشائی بن گیا ہوں۔ رنج وذلت سے خوش ہوتا ہوں۔ یعنی میں نے اپنے کو اپنا غیر تصور کیا ہے۔ جو دکھ مجھے پہنچتا ہے، کہتا ہوں: لو، غالب کے ایک اور جوتی لگی۔ بہت اِتراتا تھا کہ مَیں بڑا شاعر اور فارسی دان ہوں۔ آج دور دور تک میرا جواب نہیں۔ لے اب قرضداروں کو جواب دے۔ سچ تو یوں ہے، غالب کیا مرا، بڑا ملحد مرا، بڑا کافر مرا۔ ہم نے از راہ تعظیم، جیسا بادشاہوں کو بعد اُن کے ''جنت آرام گاہ'' و ''عرش نشین'' خطاب دیتے ہیں، چونکہ یہ اپنے کو شاہ قلمرو سخن جانتا تھا، ''سقر مقر'' اور ''ہاویہ زاویہ'' خطاب تجویز کر رکھا ہے۔ ''آیئے نجم الدولہ بہادر!'' ایک قرضدار کا گریبان میں ہاتھ، ایک قرضدار بھوگ سنا رہا ہے۔ مَیں ان سے پوچھ رہا ہوں ''اجی حضرت نواب صاحب! نواب صاحب کیسے، اوغلان صاحب! آپ سلجوقی اور افراسیابی ہیں۔ یہ کیا بے حرمتی ہو رہی ہے؟ کچھ تو اُکسو، کچھ تو بولو۔'' بولے کیا بے حیا، بے غیرت، کوٹھی سے شراب، گندھی سے گلاب، بزاز سے کپڑا، میوہ فروش سے آم، صراف سے دام قرض لیے جاتا تھا۔ یہ بھی سوچا ہوتا، کہاں سے دوں گا۔''

[خطوط غالب، صفحہ ۱۱۹]

کے مرقعے پیش کرتے رہے۔ ان امور نے خطوط کی ادبی روح کو (آپ بیتی کے نقطۂ نظر سے) بڑا دلچسپ اور دلکش بنادیا ہے۔ اور ہم ان خطوط کے آئینے میں ایک ایسی آفاقی شخصیت کی جھلک دیکھتے ہیں جو زندگی کا ایک خاص مسرت بخش فلسفہ رکھتے ہوئے زندگی کی محرومیوں اور ناکامیوں سے نبرد آزما ہے۔ یہ عظیم شخص اپنی ناکامیوں اور محرومیوں پر کڑھتا نہیں بلکہ ان پر استہزا کرتا ہے۔ وہ زندہ دلی اور خوش باشی سے جینے کی نئی نئی راہیں تلاش کرتا ہے۔ غم والم کو زندگی کی ایک حقیقت سمجھتے ہوئے غم سے نباہ کی صورتیں پیدا کرتا ہے، شاعری میں بھی اور خطوط میں بھی۔ شاعری میں اگر وہ ایک مفکر بن کر جذبۂ غم کا تجزیہ کرتا ہے تو خطوط میں زندہ دلی سے غم کے برداشت کرنے کا عملی ثبوت دیتا ہے، اور اس طرح ایک ایسے حوصلہ مند انسان کا نمونہ پیش کرتا ہے جو آلام روزگار کو نہ صرف اپنے لیے آسان بنالیتا ہے بلکہ دوسروں میں بھی ضبط و برداشت اور حوصلہ مندی و زندہ دلی کے جذبات ابھارتا ہے۔ جس انسان کا نظریۂ حیات یہ ہو:

اِن آبلوں سے پاؤں کے گھبرا گیا تھا میں

جی خوش ہوا ہے راہ کو پُر خار دیکھ کر

اس کے ضبط و حوصلے کی انتہا کیا ہوسکتی ہے! خطوط غالب کے مطالعے سے معلوم ہوگا کہ ضبط و حوصلے کے یہ بندھن جب کبھی ٹوٹنے لگتے ہیں تو وہ نہایت زندہ دلی و شوخی سے پھر ان کو استوار کر کے سیلاب غم کو بے اثر بنادیتے ہیں۔ خطوط غالب کی یہ مہاتی روح اور حیات بخش عناصر ایسے ہیں جو غالب کی آپ بیتی کو زندہ و تابندہ بنا کر پیش کرتے ہیں اور ہم اسے ایک غیر معمولی صلاحیتوں اور عظیم ذہن و فکر کے انسان کی سرگزشت سمجھ کر دلچسپی سے پڑھتے ہیں۔ حقیقت اور رومان کا امتزاج کبھی کبھی اس قسم کی کیفیات کا مرقع بن کر سامنے آتا ہے:

میاں، تمھارے انتقالات ذہنی نے مارا۔ میں نے کب کہا تھا کہ تمھارا کلام اچھا نہیں؟ میں نے کب کہا تھا کہ دنیا میں کوئی سخن فہم و قدر دان نہ ہوگا؟ مگر بات یہ ہے کہ تم مشق سخن کر رہے ہو اور میں مشق فنا میں مستغرق ہوں۔ بوعلی سینا کے علم کو اور نظیری کے شعر کو ضائع اور بے فائدہ اور موہوم جانتا ہوں۔ زیست بسر کرنے کو کچھ تھوڑی سے راحت درکار ہے اور باقی حکمت اور سلطنت اور شاعری اور ساحری 'سب خرافات ہے۔ ہندوؤں میں اگر کوئی اوتار ہوا تو کیا اور مسلمانوں میں نبی بنا تو کیا؟ دنیا میں نامور ہوئے تو کیا اور گمنام جیے

تو کیا؟ کچھ وجہ معاش ہو اور کچھ صحت جسمانی۔ باقی سب وہم ہے اے یار جانی۔ ہر چند وہ بھی وہم ہے۔ مگر میں ابھی اس پایے پر ہوں۔ شاید آگے بڑھ کر یہ پردہ بھی اُٹھ جائے اور وجہ معیشت اور صحت و راحت سے بھی گزر جاؤں، عالم بیرنگی میں گزر پاؤں۔ جس سناٹے میں ہوں وہاں تمام عالم بلکہ دونوں عالم کا پتہ نہیں۔ ہر کسی کا جواب مطابق سوال کے دیے جاتا ہوں اور جس سے جو معاملہ ہے اُس کو ویسا ہی برت رہا ہوں لیکن سب کو وہم جانتا ہوں۔ یہ دریا نہیں ہے سراب ہے۔ ہستی نہیں پندار ہے۔ ہم تم دونوں اچھے خاصے شاعر ہیں۔ مانا کہ سعدی و حافظ کے برابر مشہور ہو گئے۔ اُن کو شہرت سے کیا حاصل ہوا کہ ہم تم کو ہوگا؟"

[خطوط غالب، صفحہ ۱۸۴، ۱۸۵]

زندگی کے بارے میں یہ فکر و احساس اگر چہ یاس انگیز ہے مگر آفاقی سطح کا حامل ہے!

شوخی و ظرافت:

غالب نے آنسوؤں اور قہقہوں کے درمیان زندہ رہنے اور زندگی کا احساس دلانے کی جو راہ تلاش کی، اُس میں شوخی و ظرافت کا عنصر بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ سرچشمۂ غم سے پھوٹنے والی ظرافت کوئی معمولی درجے کی ظرافت نہیں ہوا کرتی۔ اس میں زندگی کی حقیقتیں اور زندگی کے تضادوں سے پیدا ہونے والی بصیرتیں بھی شامل ہوتی ہیں۔ اس قسم کی ظرافت کی تخلیق کے لیے دل گداختہ ہی کی ضرورت نہیں ہوتی بلکہ ایک عظیم ذہن و فکر کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ غالب قلب و ذہن کے اعتبار سے اُس مقام پر تھے جہاں اس قسم کی اعلیٰ ظرافت کے سرچشمے پھوٹتے ہیں۔ غالب کا اجتماعی ماحول غم انگیز تھا۔ محفلیں ویران ہو گئی تھیں۔ احباب بچھڑ گئے تھے۔ موت کی گرم بازاری نے ہر طرف افسردگی، یاس اور بے رونقی پھیلا دی تھی۔ اس افسردہ اور یاس انگیز ماحول میں بھی غالب نے خوش طبعی سے زندگی بسر کرنے کا جو ضابطۂ حیات اپنایا، اُس کو وہ اپنی ذات تک ہی محدود نہیں رکھتے بلکہ اپنے احباب کو بھی اس میں شریک کرنا ضروری سمجھتے ہیں تاکہ اُجڑی محفل کی بے رونقی کا کچھ تو مداوا ہو جائے:

دل لگی کی آرزو بے چین رکھی ہے ہمیں
ورنہ یاں بے رونقی سُودِ چراغِ کشتہ ہے

"دل لگی" کے اس رجحان نے اُن کے خطوط میں شوخی وظرافت کی ایسی ایسی شگوفہ کاری کی ہے کہ غم کا احساس رکھتے ہوئے بھی انسان مسکرانے کی ہمت پیدا کر لیتا ہے۔ زندہ ولی سے جینے کا یہ قرینہ اُن مواقع پر خاص طور سے قابل دید ہوتا ہے جب غالب اپنے کسی آزردہ خاطر دوست کو حزن وغم کے موقع پر خط لکھتے ہوئے اظہار ہمدردی کرتے ہیں۔ زندگی میں موت ایک بہت بڑا حادثہ اور قدرتی طور پر غم کا باعث ہے۔ اس سے بھی زیادہ یہ موقع اُن احباب کی آزمائش کا ہوتا ہے جو غم کے اس موقعے پر تعزیت کا فرض ادا کرنے کی کوشش کرتے ہیں، اور سب طرف سے لاچار ہو کر رسمی جملوں اور پیرایوں کا سہارا لیتے ہیں۔ لیکن غالب کی زندہ دلی ایسے مواقع پر بھی جس طرح تعزیت جیسے رقت انگیز موضوع کو ظرافت کا عنوان بناتی اور غم زدہ انسان میں صبر وضبط کا حوصلہ پیدا کرتی ہے، اس کی مثال مشکل ہی سے ملے گی۔ تعزیت کے دو مواقع ملاحظہ فرمائیے:

"امراؤ سنگھ کے حال پر اس کے واسطے مجھ کو رحم اور اپنے واسطے رشک آتا ہے۔ اللہ اللہ! ایک وہ ہیں کہ دو بار ان کی بیڑیاں کٹ چکی ہیں، ایک ہم ہیں کہ ایک اوپر پچاس برس سے جو پھانسی کا پھندا گلے میں پڑا ہے، نہ پھندا ہی ٹوٹتا ہے، نہ دم ہی نکلتا ہے۔ اُس کو سمجھاؤ کہ میں تیرے بچوں کو پال لوں گا، تو کیوں بلا میں پھنستا ہے؟"

[خطوط غالب، صفحہ ۱۷۸]

"مرزا صاحب، ہم کو یہ باتیں پسند نہیں۔ پینسٹھ برس کی عمر ہے۔ پچاس برس عالم رنگ و بو کی سیر کی۔ ابتدائے شباب میں ایک مرشد کامل نے ہم کو یہ نصیحت کی کہ ہم کو زہد و ورع منظور نہیں۔ ہم مانع فسق و فجور نہیں۔ پیو، کھاؤ، مزے اُڑاؤ۔ مگر یہ یاد رہے کہ مصری کی مکھی بنو، شہد کی مکھی نہ بنو۔ سو میرا اس نصیحت پر عمل رہا ہے۔ کسی کے مرنے کا وہ غم کرے جو آپ نہ مرے۔"

[خطوط غالب، صفحہ ۲۳۷]

تعزیت کے علاوہ شکوے اور خفگی کے موقع پر بھی وہ ایسا انداز اختیار کرتے ہیں کہ پڑھنے والا اس کی تلخی محسوس نہیں کرتا، بلکہ محظوظ ہوتا ہے۔ شکوے میں بھی غالب نے اپنی جدت طبع کی بدولت ایک نیا اسلوب اختیار کیا ہے:

"فقیر شکوہ سے بُرا نہیں مانتا، مگر شکوہ کے فن کو سوائے میرے کوئی نہیں جانتا۔ شکوے کی

خوبی یہ ہے کہ راہ راست سے منہ نہ موڑے اور معہذا دوسرے کے واسطے جواب کی گنجائش نہ چھوڑے۔''

[خطوط غالب، صفحہ۲۱۹]

''کیوں صاحب، یہ امر ایسا کیا دشوار تھا کہ آپ نے نہ کیا؟ اور اگر دشوار تھا تو اس کی اطلاع دینی کیا دشوار تھی؟ ابھی شکایت نہیں کرتا، پوچھتا ہوں کہ آیا یہ امور مقتضی شکایت ہیں یا نہیں؟''

[خطوط غالب، صفحہ۲۲۲]

''پیرو مرشد، بارہ بجے تھے، مَیں ننگا اپنے پلنگ پر لیٹا ہوا حقہ پی رہا تھا کہ آدمی نے آکر خط دیا۔ مَیں نے کھولا، پڑھا۔ بھلے کو انگرکھا یا کُرتا گلے میں نہ تھا۔ اگر ہوتا تو مَیں گریبان پھاڑ ڈالتا۔ حضرت کا کیا جاتا؟ نقصان میرا ہوتا۔''

[خطوط غالب، صفحہ ۳۶۶]

خطوط غالب کے ادبی محاسن کے سلسلے میں اور بھی کئی باتیں قابل ذکر ہیں۔ قدیم زمانے کی مقفیٰ و مسجع نثر تکلف اور اہتمام کی وجہ سے خاصی بدنام ہو چکی ہے۔ لیکن قافیوں کا التزام اگر بے تکلف ہونے کی بجائے بے ساختہ ہو، تو ادبی نثر میں شعریت کا لطف و کیف پیدا ہو جاتا ہے۔ خطوط غالب میں گاہے بگاہے بے ساختہ قوافی اُن کی نثر میں حسن پیدا کر دیتے ہیں۔ لفظی رعایتوں، صنعتوں، نادر تشبیہوں اور تمثیلوں کے ذریعے بھی وہ اپنی سادہ نثر میں رنگینی پیدا کر لیتے ہیں۔ لیکن یہ سب باتیں، جو مجموعی طور پر خطوط کی دلکشی کا باعث ہیں، محاسن خطوط غالب کے سلسلے میں اضافی کہی جا سکتی ہیں۔ اصل حسن تحریر خطوط میں غالب کی ادبی شخصیت کے بے ساختہ اظہار کا ہے، جس کی گوناگوں کیفیات کا مجمل سا تذکرہ صفحات ماقبل میں ہوا۔

محاسن خطوط غالب کو پیش کرنے کے سلسلے میں مغرب کے بعض نامور ادیبوں کی اسی نوع کی نگارشات سے موازنے کی صورت بھی ممکن ہے (جیسا کہ پہلے معمول رہا ہے) لیکن ہم یہ کام مغرب کے نقادوں پر چھوڑتے ہیں کہ وہ اس سلسلے میں اپنے ہاں کے نامور ادیبوں کی نگارشات کا غالب سے موازنہ کر کے اُن کی عظمت کا لوہا منوائیں!

غالب کا اجتماعی احساس

برعظیم پاک و ہند میں مغل سلطنت کے انحطاط کے ساتھ سیاسی کشمکش کا جو سلسلہ شروع ہوا، وہ غالب کے زمانے تک فیصلہ کن مرحلے میں داخل ہو چکا تھا۔ ملک کے بیشتر حصوں پر ایسٹ انڈیا کمپنی کی عملداری قائم ہو گئی تھی۔ مرہٹہ جنگ (۵-۱۸۰۳ء) میں لارڈ لیک نے ۱۸۰۳ء میں آگرہ سے بڑھ کر دہلی پر قبضہ کیا۔ مرزا غالب کے حقیقی چچا نصر اللہ بیگ ان فتوحات میں جنرل لیک کے ساتھ تھے۔ فتح دہلی کے بعد کٹ پتلی مغل بادشاہ (شاہ عالم ثانی) جو پہلے مرہٹوں کے زیر اثر تھا، اب کمپنی کے کنٹرول میں آ گیا۔ اس کے بعد برعظیم میں کوئی ایسی بڑی قوت موجود نہیں تھی جو کمپنی کی یلغار کو روک سکے۔ پنجاب کی سکھا شاہی، کمپنی کے مقبوضات اور افغان سلطنت کے مابین ایک عارضی بفرسٹیٹ کا کام دے رہی تھی۔ کمپنی کی باجگزار دیسی ریاستیں ''سب سنڈی ایری سسٹم'' اور الحاق کی حکمت عملی کے تحت جاں کنی کی حالت میں تھیں۔ اس طرح عملاً سارا ملک ایسٹ انڈیا کمپنی کے زیر نگیں آ چکا تھا اور کشت وخون کا وہ بازار قدرے سرد پڑ گیا تھا جو اٹھارویں صدی میں مغلوں کے مرکزی نظام حکومت کی کمزوری کی وجہ سے خاصا گرم رہا تھا۔ نظم ونسق کے قیام سے اجتماعی زندگی بظاہر پُرسکون ہو گئی تھی۔ کاروبار، رسل ورسائل اور زراعت وغیرہ معمول پر آ گئے تھے۔ اُجڑے ہوئے نگر آباد ہونے لگے۔ کمپنی کا مرکز حکومت اگرچہ کلکتہ تھا لیکن دہلی، انگریزی تسلط کے بعد پھر آباد ہونے اور اپنا کھویا ہوا وقار بحال کرنے لگی۔ لال قلعے کا شاہی اقتدار تو ایک عرصہ پہلے ختم ہو چکا تھا لیکن برائے نام مغل بادشاہ کے نام سے اس کا ایک بھرم سا باقی رہ گیا تھا۔

سیاسی کشمکش یا جنگ وجدل کا سلسلہ ختم ہو کر ماحول بظاہر پُرسکون ہو گیا تھا لیکن اس

کے ساتھ ہی ذہنی کشمکش اور نفسیاتی جنگ کا ایک دوسرا مرحلہ شروع ہو گیا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے اقتدار نے ملک سے بدامنی اور شورش تو ختم کر دی، لیکن خود یہ اقتدار جس صورت میں قائم ہوا وہ یہاں کے تاریخی حالات اور تہذیبی روایات کے منافی تھا۔ اگر مغل سلطنت کو ختم کر کے برسرِ اقتدار آنے والی طاقت یہاں کے حالات و روایات کے مطابق ہوتی اور حاکم و محکوم کے درمیان رنگ و نسل اور تہذیب و تمدن کی مغائرت کی اونچی اونچی دیواریں نہ ہوتیں، تو یہ انقلاب حکومت ملک کے لئے بڑا خوش آیند ہوتا۔ لیکن واقعہ یہ تھا کہ نئے فاتحین اجنبی تھے اور اجنبی بن کر ہی یہاں اپنا راج قائم کرنا اور ملکی دولت اور وسائل کا استحصال کرنا چاہتے تھے۔ سامراج کا یہ وہ انوکھا روپ تھا جس سے برِ عظیم کے باشندوں کو کبھی سابقہ نہیں پڑا تھا۔ اس لئے قدرتی طور پر نئے نظامِ حکومت سے یہاں کے باشندوں کی ذہنی و جذباتی مفاہمت ممکن نہیں تھی۔ مغل سلطنت، جیسی بھی تھی، یہاں کے باشندوں کے لئے بلا امتیاز مذہب و ملت ایک طرح کی قومی حکومت کا درجہ رکھتی تھی۔ کمپنی کی حکومت نفسیاتی طور پر اس کی جگہ پُر نہیں کر سکتی تھی۔ اس لئے کمپنی کی عملداری قائم ہو جانے کے باوجود ملک کے جمہور ذہنی طور پر برائے نام مغل بادشاہ سے عقیدت رکھتے تھے۔

کمپنی کی حکومت کے قیام کے ساتھ جو معاشی، تعلیمی، تہذیبی اور معاشرتی تبدیلیاں ظہور میں آ رہی تھیں، اُن کو جمہور بجا طور پر شک و شبہے کی نظر سے دیکھ رہے تھے۔ لیکن عملاً بے بس ہو چکے تھے، اس لئے بے چینی اور اضطراب کی ایک داخلی لہر تھی جو قلب و ذہن میں پھیلتی جا رہی تھی۔ انیسویں صدی کے آغاز سے ذہنی و جذباتی کشمکش کا یہ سلسلہ شروع ہوا۔ کمپنی کے مقبوضات میں توسیع کے ساتھ ساتھ یہ اندرونی اضطراب بھی بڑھتا گیا۔ حتیٰ کہ ۱۸۵۷ء میں یہ آتش فشاں لاوا انتہا تک پہنچ کر پھٹ پڑا۔ لاکھوں انسانوں کی قربانی لے کر یہ آگ فرو ہوئی اور برِ عظیم پر اجنبی سامراج کا تسلط ایک تاریخی حقیقت بن گیا۔

غالب کی ذہنی نشو و نما اس پُر اضطراب اجتماعی ماحول میں ہوئی۔ والد اور چچا کی وفات کے بعد بچپن ہی سے انھیں سنگین حالات سے دوچار ہونا، اور آرزوؤں اور خواہشوں کی لامتناہی فضاؤں میں رہتے ہوئے زندگی کے تلخ حقائق سے نبرد آزما ہو کر اپنا راستہ بنانا پڑا۔ غالب ایک رومانی ادیب و شاعر تھے لیکن عملی زندگی میں ہم انھیں ایک حقیقت پسند اور معاملہ فہم انسان کی طرح اپنے نجی مسائل و معاملات سلجھاتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ اپنی پنشن کے جھگڑے کے سلسلے میں کلکتہ

تک کا سفر، سرکار انگریزی میں اپنے موروثی تعلقات کی بنا پر حصول عزت و جاہ کی کوشش، قلعہ معلیٰ کے وظیفے اور مصاحبت شاہ کے علی الرغم "کومین پوئیٹ" بننے کے لئے تگ ودو، یہ وہ مراحل تھے جن سے وہ ۱۸۵۷ء سے پہلے گزرے۔ انقلاب ۱۸۵۷ء میں کمپنی کی حکومت کی نہ تو خیر خواہی کی اور نہ ہی اس سے کوئی بے وفائی کی۔ اور انقلاب کے بعد جب ملکی باشندے جرم و سزا کے شکنجے میں جکڑے ہوئے نظر آتے تھے، غالب کا اپنی پنشن کی بحالی کے لئے کوشش کرنا اور حکام سے رابطہ قائم کر کے اپنے بارے میں شکوک وشبہات کو رفع کرنا، یہ سب باتیں عملی زندگی میں ذاتی سطح پر بڑی حقیقت پسندانہ نظر آتی ہیں۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ غالب کاروبار زندگی میں اپنے ماحول سے مفاہمت کی پوری صلاحیت رکھتے تھے اور جیسا موقع ہوتا تھا اس کے مطابق کارروائی عمل میں لاتے تھے:

"چپکے ہو رہو اور مجھ کو کسی عالم میں غمگین اور مضطر گمان نہ کرو۔ ہر وقت میں جیسا مناسب ہوتا ہے، ویسا عمل میں آتا ہے۔"

[خط بنام میر مہدی مجروح، خطوط غالب، مرتبہ مہر، ص ۲۹۳]

عملی زندگی کا یہ وہ میدان تھا جس میں ایک عام دنیا دار فرد کی حیثیت سے غالب کو حالات سے مفاہمت کر کے زیست کو اپنے اور اپنے لواحقین کے لئے خوشگوار بنانا پڑ رہا تھا۔ بعض اوقات اپنی مطلب براری کے لئے غالب خودداری کے معروف مفہوم سے بھی گزر کر حالات سے سمجھوتہ کرتے نظر آتے ہیں۔ یہ بات اُن کی شاعرانہ انا کے برعکس ۲ معلوم ہوتی ہے، لیکن امر واقعہ کا کیا کیجئے۔ جو لوگ غالب کو ایک قومی ہیرو کی حیثیت سے دیکھتے اور انھیں بشری کمزوریوں سے مبرا سمجھتے ہیں، اُن کے لئے شاید یہ باتیں ناقابل قبول ہوں۔ لیکن حقیقت موجود ہو تو اس سے گریز اچھا نہیں ہوتا۔ غالب کو ایک عام فرد کی طرح زندگی میں اگر اس طرح کے سمجھوتے کرنے پڑے تو اس میں ان کی بشری کمزوریاں اور حالات کی مجبوریاں بھی قابل لحاظ ہیں۔ لیکن جہاں تک

(۱) بحوالہ مکاتیب غالب، چوتھا ایڈیشن ۱۹۴۶ء صفحہ ۱۶

(۲) شاعری میں تو غالب کی خود شناسی کا یہ عالم ہے کہ

بندگی میں بھی وہ آزادہ و خودبیں ہیں کہ ہم
اُلٹے پھر آئے در کعبہ اگر وا نہ ہوا

ان کے ذہنی عمل اور شاعرانہ فکر و احساس کا تعلق ہے، ضروری نہیں کہ عملی زندگی کی یہ مفاہمتیں اس کے راستے میں بھی حائل ہوئی ہوں۔ شاعر کا جسم اگر حالات کا پابند ہوتا ہے تو یہ لازمی امر نہیں کہ اس کی روح بھی حالات میں جکڑی ہوئی ہو۔ ایک انسان کی زندگی کو یوں دو خانوں میں تقسیم کرنا طبعی لحاظ سے شاید ممکن نہ ہو، مگر اس کا کیا کیا جائے کہ شاعر اور فن کار اس معاملے میں بالعموم دو دنیاؤں میں گھومتے نظر آتے ہیں۔ ایک دنیا ہم آپ اور شاعر سب کی ہے اور دوسری آرزو کی وہ دنیا جہاں شاعر کا فکر و احساس مادی آلائشوں سے قدرے بلند ہو کر تخیل کے وسیع مرغزاروں کی گلگشت کرتا ہے۔ تخیل اور حقیقت کی یہ کشمکش زندگی میں لازمی ہے۔ انسان جتنا زیادہ حساس ہوگا، اتنی ہی زیادہ یہ کشمکش شدید ہوگی۔ غالب کا اجتماعی احساس اس لحاظ سے غالب کے اس طرزِ عمل سے، جو عام کاروبارِ زیست میں حالات سے مفاہمت کے اصول پر مبنی ہے، خاصا الگ معلوم ہوگا۔ اس کا اظہار ان کی شاعری میں بھی ہوا ہے اور خطوط میں بھی۔ چونکہ شاعری میں (خصوصاً غزل میں) صراحت کم اور خارجی ماحول کے بارے میں رمز و کنائے کا انداز زیادہ ہوتا ہے، اس لئے یہاں فکر و احساس کی صحیح جہت کا اندازہ لگانا قدرے دشوار ہے۔ خطوط میں یہ بات نہیں ہوتی۔ یہاں ہم شاعری کی بحث کو الگ رکھتے ہوئے خطوط کے آئینے میں غالب کے اجتماعی احساس کا مطالعہ کرتے ہیں، تاکہ ذہنی کشمکش کے اس دور میں غالب کی سوچ کا یہ رُخ واضح ہو جائے۔ پھر اس کے حوالے سے اُن کی شاعری کا تجزیہ بھی آسانی سے ہو سکتا ہے۔

خطوطِ غالب میں ایک رویہ تو حالات سے مفاہمت اور موقع کے مطابق کارروائی کرنے کا ملتا ہے جو غالب کی معاملہ فہمی اور دُور اندیشی کو ظاہر کرتا ہے۔ معاملے کے اس پہلو کے علاوہ خطوطِ غالب میں حالات و واقعات کے بارے میں وہ ذہنی ردِ عمل بھی ملتا ہے جس کا تعلق محض غالب کی ذات سے نہیں بلکہ اُن کے اجتماعی ماحول سے تھا۔ اس ذہنی ردِ عمل سے ہم غالب کے اجتماعی احساس کا اندازہ کر سکتے ہیں اور یہ دیکھ سکتے ہیں کہ وہ اپنے قلب و ذہن میں اس انقلابِ زمانہ پر کیا محسوس کر رہے تھے۔

انقلاب ۱۸۵۷ء سے قبل کمپنی کے پنشن خوار اور شہ۔ کے وظیفہ خوار کی حیثیت سے غالب کی روزی کا سامان بنا ہوا تھا۔ کمپنی کی حکومت میں مغل بادشاہت کی آخری نشانی کا وجود

نفسیاتی طور پر کشمکش کا ایک اہم مظہر تھا۔ اگر چہ یہ کشمکش ایک نقطۂ ارتقا کی طرف بڑھ رہی تھی اور سوچنے والے لوگوں کے ذہن تیزی سے بدلتے ہوئے حالات میں ہوا کا رُخ دیکھ رہے تھے۔ خصوصاً الحاق کی پالیسی کے مطابق جس طرح دیسی ریاستیں اور موروثی امارتیں ختم کی جارہی تھیں، اس سے واضح طور پر یہ حقیقت سامنے آگئی تھی کہ مغل بادشاہت کی آخری نشانی اب قلعہ معلٰی میں آخری دموں پر ہے۔ ۱۸۵۶ء میں انتزاعِ سلطنت اودھ ایک بڑے حادثے کی طرح ظہور میں آیا۔ یہ حادثہ بھی آئندہ حادثات کا پیش خیمہ تھا۔ غالب نے اس موقعہ پر جو کچھ محسوس کیا، اس کا اظہار ایک دوست کے نام خط میں اس طرح کیا:

''۔۔۔آپ ملاحظہ فرمائیں ہم اور آپ کس زمانے میں پیدا ہوئے؟ اور کی فیض رسانی اور قدردانی کو کیا روئیں، اپنی تکمیل ہی کی فرصت نہیں۔ تباہی، ریاست اودھ نے باآنکہ بیگانہ محض ہوں، مجھ کو اور بھی افسردہ دل کر دیا، بلکہ میں کہتا ہوں کہ سخت ناانصاف ہوں گے وہ اہلِ ہند، جو افسردہ دل نہ ہوئے ہوں گے، اللہ ہی اللہ ہے!''

[خط بنام میر غلام حسنین قدر بلگرامی، نگاشتہ بست وسوم فروری ۱۸۵۷ء]

انقلاب ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ ۱۱مئی کو برپا ہوا۔ یہ خط ۲۳ فروری کو یعنی اس واقعہ سے تقریباً ڈھائی ماہ پیشتر لکھا گیا۔ اس میں جس واقعہ (انتزاعِ سلطنت اودھ) پر افسردہ دلی کا اظہار کیا گیا ہے، وہ ان بے شمار واقعات میں سے ایک تھا جو بتدریج کشمکش کو تیز تر اور انقلاب کے ہنگامے کو قریب تر لا رہے تھے۔ خود دہلی کی ''بزمِ آخر'' میں خصوصاً اس کی ٹمٹماتی ہوئی آخری شمع ''قلعہ معلٰی'' میں جو کچھ ہو رہا تھا، وہ سب غالب کی نگاہوں کے سامنے تھا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت جس تدریج کے ساتھ اس شمع کو گُل کرنے کے لئے اقدامات کر رہی تھی اور لال قلعے کے بے دست و پا تاجدار اور اس کے وابستگان دامنِ دولت جس بے بسی سے ان حالات کے بہاؤ میں بہہ رہے تھے، اس کا اندازہ اس خط سے لگایئے جو واقعہ انقلاب سے تین برس پیشتر لکھا گیا:

''مشاعرہ یہاں شہر میں کہیں نہیں ہوتا۔ قلعے میں شہزادگانِ تیموریہ جمع ہو کر غزل خوانی کر لیتے ہیں۔ وہاں کے مصرعۂ طرحی کو کیا کیجئے گا، اور اس پر غزل لکھ کر کہاں پڑھیئے گا؟ میں کبھی اس محفل میں جاتا ہوں اور کبھی نہیں جاتا، اور یہ صحبت خود چند روزہ ہے، اس کو دوام

کہاں؟ کیا معلوم ہے اب ہی نہ ہو، اب کے ہو تو آئندہ نہ ہو!''

[بنام قاضی عبدالجمیل جنوں، ۱۸۵۴ء، خطوطِ غالب، ص ۵۲۰]

آخر وہ حادثہ پیش آ کر رہا جس کا ایک مدت سے انتظار تھا۔ ۱۰ مئی ۱۸۵۷ء کو انقلاب کا آغاز ہوا اور کمپنی کی باغی سپاہ نے اگلے روز (۱۱ مئی) دہلی پہنچ کر مغل تاج دار بہادر شاہ ظفر کے نام پر یہاں کا نظم و نسق سنبھالا۔ ستمبر ۱۸۵۷ء کے تیسرے ہفتے میں انگریزی سپاہ، سکھ لشکر کی معیت میں دوبارہ دہلی پر قابض ہوئی اور ''کالوں'' کے ہنگامے کے بعد ''گوروں'' کی انتقامی کارروائی اور قتل و غارت گری شروع ہوئی۔ اس طرح برعظیم کی تاریخ کا ایک نیا دَور شروع ہوا۔ دہلی میں مغلیہ بادشاہت کی آخری شمع بجھ گئی، اس کے ساتھ کمپنی کی حکومت کا بھی خاتمہ ہو گیا اور ہندوستان براہِ راست تاجِ برطانیہ کے زیرِ سایہ آ گیا۔

یہ انقلابِ عظیم غالب کی نگاہوں کے سامنے برپا ہوا۔ وہ اس خونیں ہنگامے کے عینی شاہد، بلکہ اس قلزمِ خون کے شناور تھے(۱)۔ ہر چند کہ ہنگامۂ انقلاب کے فرو ہو جانے کے بعد روزی کی مشکلات اور پنشن کی بازیافت کے لئے غالب کو وہ سب کچھ کرنا پڑا جو ایک عام دنیادار انسان ایسے حالات میں کرتا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ ان کا اجتماعی احساس اس تہذیبی المیّے پر خون کے آنسو بہائے بغیر بھی نہ رہ سکا۔ خونِ جگر کے ان قطروں کی تھوڑی سی جھلک تو اس قطعے میں ملتی ہے جو غالب نے علاء الدین علائی کے نام ایک خط (محررہ ۱۸۵۸ء) میں لکھا ہے:

بسکہ فعال ما یرید ہے آج — ہر سلحشور انگلستاں کا
گھر سے بازار میں نکلتے ہوئے — زہرہ ہوتا ہے آبِ انساں کا
چوک جس کو کہیں، وہ مقتل ہے — گھر بنا ہے نمونہ زنداں کا
شہرِ دہلی کا ذرّہ ذرّۂ خاک — تشنۂ خوں ہے ہر مسلماں کا
کوئی واں سے نہ آ سکے یاں تک — آدمی واں نہ جا سکے، یاں کا
مَیں نے مانا کہ مل گئے پھر کیا — وہی رونا تن و دل و جاں کا

---

(۱) ''مَیں مع زن و فرزند ہر وقت اسی شہر میں قلزمِ خون کا شناور رہا ہوں۔''

[خط بنام چوہدری عبدالغفور سرور، ستمبر ۱۸۶۰ء]

گاہ جل کر کیا کیے شکوہ　　سوزش داغ ہائے پنہاں کا
گاہ رو کر کہا کیے باہم　　ماجرا دیدہ ہائے گریاں کا
اسی طرح کے وصال سے یا رب　　کیا مٹے دل سے داغ ہجراں کا

اس کے علاوہ خطوط میں بھی غالب نے اپنے قلبی جذبات کا اظہار کیا ہے۔ یہ اظہار وہ برملا نہیں کر سکتے تھے۔ انگریزی دار و گیر میں صاف صاف لکھنا اور اسے ڈاک کے سپرد کرنا ممکن نہیں تھا۔(۱) پھر بھی غالب نے واقعہ انقلاب کے سلسلے میں حالات و کوائف بیان کرتے ہوئے دبے دبے الفاظ میں اپنے تاثرات و احساسات بھی پیش کر دیے ہیں۔ انقلاب کے بارے میں مذکورہ بالا قطعے کے علاوہ منشی ہرگوپال تفتہ کے نام ایک خط میں اس سانحہ عظیم کو وہ جس خیال انگیز پیرائے میں بیان کرتے ہیں، اس سے ان کے دل کی کیفیات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے:

---

(۱) اس ذہنی گھٹن کا اظہار غالب کے بعض خطوں میں ہوا ہے۔ مثلاً

"آدمی تو آتے جاتے رہتے ہیں۔ خدا کرے یہاں کا حال سن لیا کرتے ہو۔ اگر جیتے رہے اور ملنا نصیب ہوا تو کہا جائے گا۔ ورنہ قصہ مختصر، قصہ تمام ہوا۔ لکھتے ہوئے ڈرتا ہوں اور وہ بھی کون سی خوشی کی بات ہے جو لکھوں!" [خط بنام مرزا شہاب الدین احمد خاں ثاقب، ۸ فروری ۱۸۵۸ع]

"مفصل حالات لکھتے ہوئے ڈرتا ہوں۔ ملازمان قلعہ پر شدت ہے۔ باز پرس اور دار و گیر میں مبتلا ہیں" [خط بنام ہرگوپال تفتہ، ۵ دسمبر ۱۸۵۷ع]

"انصاف کرو، لکھوں تو کیا لکھوں؟ کچھ لکھ سکتا ہوں؟ کچھ قابل لکھنے کے ہے؟ تم نے مجھ کو لکھا تو کیا لکھا؟ اور اب جو میں لکھتا ہوں تو کیا لکھتا ہوں؟ بس اتنا ہی ہے کہ اب تک ہم تم جیتے ہیں۔ زیادہ اس سے نہ تم لکھو گے نہ میں لکھوں گا۔"

[خط بنام حکیم غلام نجف خاں، ۲۶ دسمبر ۱۸۵۷ع]

"قلم ہات میں لیے پر جی بہت کچھ لکھنے کو چاہتا ہے، مگر کچھ نہیں لکھ سکتا۔ اگر مل بیٹھنا قسمت میں ہے تو کہہ لیں گے، ورنہ انا للہ وانا الیہ راجعون۔" [ایضاً، ۱۹ جنوری ۱۸۵۸ع]

''صاحب! تم جانتے ہو کہ یہ معاملہ کیا ہے اور کیا واقع ہوا؟ وہ ایک جنم تھا کہ جس میں ہم تم باہم دوست تھے اور طرح طرح کے ہم میں تم میں معاملات مہر و محبت در پیش آئے۔ شعر کہے، دیوان جمع کئے۔ اسی زمانے میں ایک بزرگ تھے کہ وہ ہمارے تمہارے دوست دلی تھے اور منشی نبی بخش ان کا نام اور حقیر تخلص تھا۔ ناگاہ نہ وہ زمانہ رہا، نہ وہ معاملات، نہ وہ اختلاط، نہ وہ انبساط، بعد چند مدت کے پھر دوسرا جنم ہم کو ملا۔ اگرچہ صورت اس جنم کی بعینہ مثل پہلے جنم کے ہے۔ یعنی ایک خط میں نے منشی نبی بخش صاحب کو بھیجا۔ اس کا جواب مجھ کو آیا اور ایک خط تمہارا کہ تم بھی موسوم بہ منشی ہرگوپال اور متخلص بہ تفتہ ہو، آج آیا اور میں جس شہر میں ہوں اس کا نام بھی دلی اور اس محلے کا نام بلی ماروں کا محلہ ہے۔ لیکن ایک دوست اس جنم کے دوستوں میں سے نہیں پایا جاتا۔ واللہ ڈھونڈ ھنے کو مسلمان اس شہر میں نہیں ملتا۔ کیا امیر، کیا غریب، کیا اہل حرفہ، اگر کچھ ہیں تو باہر کے ہیں۔ ہنود البتہ کچھ کچھ آباد ہو گئے ہیں۔''

[شنبہ ۵ دسمبر ۱۸۵۷ء خطوط غالب صفحہ ۱۵۲]

اس انقلاب عظیم کو دو جنموں کی تمثیل سے بہتر انداز میں پیش کرنا غیر ممکن ہے!

دہلی اور لکھنؤ کے قدیم تہذیبی گہواروں کا مٹنا کوئی معمولی حادثہ نہیں تھا۔ غالب نے اس پر کوئی باقاعدہ مرثیہ تو نہیں لکھا لیکن وہ اس تہذیبی المیے کو محسوس کئے اور مضطرب ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ اس احساس واضطراب کا اظہار خطوط میں جابجا ہوا ہے:

''خداوند نعمت' کیا تم دلی کو آباد اور قلعہ کو معمور اور سلطنت کو بدستور سمجھے ہوئے ہو، جو حضرت شیخ[1] کا کلام اور صاحبزادہ قطب الدین ابن مولانا فخر الدین علیہ الرحمتہ کا حال پوچھتے ہو؟ این دفتر را گاؤ خورد، گاؤ را قصاب برد و قصاب در راہ مرد۔''

[خطوط غالب، مرتبہ مہر صفحہ ۴۳۰]

''لکھنؤ کا کیا کہنا، وہ ہندوستاں کا بغداد تھا، اللہ اللہ! وہ سرکار امیر گر تھی۔ جو بے سروپا وہاں پہنچا، امیر بن گیا۔ اس باغ کی یہ فصل خزاں!''

[خطوط غالب، صفحہ ۴۳۷]

(۱) شیخ کلیم اللہ جہان آبادی (بحوالہ خطوط غالب، مرتبہ مہر)

’’ بھائی ، کیا پوچھتے ہو؟ کیا لکھوں؟ دلّی کی ہستی منحصر کئی ہنگاموں پر تھی ۔ قلعہ، چاندنی چوک[1] ہر روز مجمع جامع مسجد کا، ہر ہفتے سیر جمنا کے پُل کی، ہر سال میلہ پھول والوں کا۔ یہ پانچوں باتیں اب نہیں ۔ پھر کہو دلّی کہاں؟ ہاں کوئی شہر قلمروِ ہند میں اس نام کا تھا!‘‘

[خطوطِ غالب، صفحہ۲۹۳]

’’ بھائی ، ہندوستان کا قلمرو بے چراغ ہو گیا ۔ لاکھوں مر گئے ۔ جو زندہ ہیں ، ان میں سینکڑوں گرفتار بند بلا ہیں ۔‘‘

[خطوطِ غالب، صفحہ۲۵۶]

’’ پانچ لشکر کا حملہ پے در پے اس شہر پر ہوا: پہلا باغیوں کا لشکر، اس میں اہل شہر کا اعتبار لُٹا ۔ دوسرا لشکر خاکیوں کا ، اس میں جان و مال و ناموس و مکان و مکین و آسمان و زمین و آثارِ ہستی سراسر لُٹ گئے ۔ تیسرا لشکر کال کا ، اس میں ہزار ہا آدمی بھوکے مرے ۔ چوتھا لشکر ہیضے کا ، اس میں بہت سے پیٹ بھرے مرے ، پانچواں لشکر تپ کا ، اس میں تاب و طاقت عموماً لُٹ گئی ۔‘‘

[خطوطِ غالب، صفحہ۳۶۷]

’’ ۷ نومبر ۱۴ جمادی الاول سال حال (۱۲۷۹ھ ۱۸۶۲ع) جمعہ کے دن ابوالظفر سراج الدین بہادر شاہ قید فرنگ و قید جسم سے آزاد ہوئے ۔ انا للہ وانا الیہ راجعون‘‘

[خطوطِ غالب، صفحہ۳۱۴]

واقعۂ انقلاب کے نتیجے میں مجلسی زندگی میں جو خلا پیدا ہوا اسے تو غالب نے بہت ہی شدت سے محسوس کیا ۔ بلکہ غالب کی اردو خطوط نویسی اسی مجلسی خلا کو پُر کرنے کی ایک کوشش تھی جس کے لئے انہوں نے مراسلے کو مکالمے کی صورت دی ہے ۔ صاحب عزت لوگوں کا دار و گیر کا شکار ہونا اور احباب کا شہر بدر ہو کر بچھڑ جانا ، ایک ایسا اجتماعی حادثہ تھا ۔ جسے غالب نے نجی طور پر بھی محسوس کیا اور اجتماعی طور پر بھی وہ اس سے بہت متاثر ہوئے ۔

---

(۱) یعنی انگریزوں کا ۔

''مگر دیکھا چاہیے، درخت جگہ سے اکھڑ کر بد شواری جمتا ہے۔ خلاصہ میری فکر کا یہ ہے کہ
اب بچھڑے ہوئے یار کہیں قیامت ہی کو جمع ہوں تو ہوں۔''

[خط بنام میر مہدی مجروح، ستمبر ۱۸۵۸ء]

غالب نے اپنے احباب کے نام کئی خطوں میں دہلی کی بربادی اور پھر اس کی بتدریج آبادی کے سلسلے میں متعدد واقعات بیان کئے ہیں۔ یہ بیانات اس دور کی اجتماعی زندگی کا مطالعہ کرنے اور جائزہ لینے کے سلسلے میں بہت اہم ہیں۔ واقعات کے بیان کے ضمن میں بعض جگہ وہ اہم سیاسی اور معاشی مسائل کے بارے میں اپنے تاثرات بھی پیش کر جاتے ہیں۔ ان تاثرات کی روشنی میں ہم اس نازک دور کی ذہنی کیفیات کی ایک جھلک دیکھ سکتے ہیں۔ مثلاً انقلاب ۱۸۵۷ء کے بعد جو اہم سیاسی تبدیلیاں ہوئیں، ان میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت کا خاتمہ اور بر عظیم کا براہ راست تاج برطانیہ کے زیر سایہ آنا تھا۔ غالب اس تبدیلی پر اطمینان کا اظہار کرتے ہوئے ایک خط میں لکھتے ہیں:

''حضرت یہاں دو چیزیں مشہور ہیں، ان کے باب میں آپ سے تصدیق چاہتا ہوں:
ایک تو یہ کہ لوگ کہتے ہیں کہ آگرہ میں اشتہار جاری ہو گیا ہے اور ڈھنڈورا پٹ گیا ہے کہ
کمپنی کا ٹھیکہ ٹوٹ گیا اور بادشاہی عمل ہندوستان میں ہو گیا۔ دوسری خبر یہ کہ جناب
ایڈمنسٹن صاحب بہادر گورنمنٹ کلکتہ کے چیف سکرٹرا کبر آباد کے لفٹیننٹ گورنر ہو گئے۔
خبریں دونوں اچھی ہیں، خدا کرے سچ ہوں۔''

[خط بنام مرزا حاتم علی بیگ مہر، ۲۱ ستمبر ۱۸۵۸ء]

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ انقلاب ۱۸۵۷ء میں برعظیم کے سب باشندے بلا امتیاز مذہب وملت شریک تھے۔ لیکن آتش انقلاب کے فرو ہونے کے بعد برطانوی حکومت نے سارا الزام مسلمانوں کے سر تھوپا اور ''پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو'' کی حکمت پر عمل کرتے ہوئے ہندوؤں کی حوصلہ افزائی اور مسلمانوں کی بیخ کنی کا سلسلہ شروع کیا۔ دہلی میں مسلمانوں کو شہر بدر کرنے اور مسلمان شرفا کے دارو گیر کا شکار ہونے کے اکثر واقعات خطوط غالب میں بیان ہوئے ہیں جن سے ہندو مسلم کی اس نئی سامراجی تفریق کا اظہار ہوتا ہے۔ بعض جگہ معاملہ اس سے مختلف

بھی تھا۔ مثلاً لکھنؤ کے بارے میں غالب ایک خط میں لکھتے ہیں:

''بھائی، لکھنؤ میں وہ امن وامان ہے کہ نہ ہندوستانی عملداری میں ایسا امن وامان ہوگا، نہ اس فتنہ وفساد سے پہلے انگریزی عملداری میں یہ چین ہوگا اور ایک نقل سنو، وہاں کے صاحب کمشنر بہادر اعظم نے جو دیکھا کہ عملے میں ہنود بھرے ہوئے ہیں، اہل اسلام نہیں، ہنود کو اور علاقوں پر بھیج دیا اور ان کی جگہ سب مسلمانوں کو بھرتی کیا۔ یہ آفت تو دلی پر ٹوٹ پڑی ہے۔ لکھنؤ کے سوا اور شہروں میں عملداری کی وہ صورت ہے جو غدر سے پہلے تھی۔ اب یہاں ٹکٹ چھاپے گئے ہیں۔ میں نے بھی دیکھے۔ فارسی عبارت یہ ہے'' ٹکٹ آبادی درون شہر دہلی بشرط ادخال جرمانہ۔'' مقدار روپیہ کی حاکم کی رائے پر ہے۔ آج پانچ ہزار ٹکٹ چھپ چکا ہے۔''

[خط بنام میر مہدی مجروح، فروری ۱۸۵۹ء]

نئے دفتری نظام کے بارے میں بھی غالب نے اپنے بعض خطوط میں اظہار خیال کیا ہے۔ ہنگامۂ انقلاب کے بعد غالب نے اپنی پنشن کی بازیافت کے لئے جو کوششیں کیں اور اس سلسلے میں انھیں جن مصائب ومشکلات کا سامنا کرنا پڑا، اس کا اظہار بھی خطوط میں خاصا تفصیل سے ہوا ہے۔ انگریز حکام سے ملاقاتوں میں بعض اوقات عزت نفس کو ٹھیس لگتی تو وہ صبر کا دامن پکڑتے اور جب کبھی باریابی کے موقع پر حسن سلوک کا اظہار ہوتا تو حکام کی تعریف وتوصیف کے پُل باندھتے۔ اس طرح غالب کو دفتری نظام کو ذرا قریب سے دیکھنے کا موقع ملتا رہا۔ بعض موقعوں پر انھوں نے دفتری نظام پر تنقید بھی کی ہے۔ خصوصاً انقلاب کے بعد ہنگامی حالات میں ''سکھا شاہی'' کی طرح ''گورا شاہی'' کا جو سلسلہ دراز رہا، غالب نے اس کے بارے میں اپنے احساسات کا اظہار جا بجا کیا ہے:

''نقل حکم لینی اور پھر مرافعہ کرنا اور پھر اس حکم کی نقل لینی، یہ امور ایسے نہیں کہ جلد فیصل ہو جائیں۔ حکام بے پروا، بختیار عدیم الفرصت، ہمیں پاشکستہ ...''

[خطوط غالب، صفحہ ۴۰۰]

''تم اب تک سمجھے نہیں ہو کہ حکام کیا سمجھتے ہیں اور نہ کبھی سمجھو گے۔ کیسا نو ندرائے، کیسی

نقل حکم، کیسا مرافعہ۔ جو احکام کہ دلی میں صادر ہوئے ہیں، وہ احکام قضا و قدر ہیں۔ ان کا مرافعہ کہیں نہیں۔"

[خطوط غالب، صفحہ ۴۰۳]

"ایک لطیفہ پرسوں کا سنو۔ حافظ ممو بے گناہ ثابت ہو چکے، رہائی پا چکے۔ حاکم کے سامنے حاضر ہوا کرتے ہیں۔ املاک اپنی مانگتے ہیں۔ قبض و تصرف ان کا ثابت ہو چکا ہے۔ صرف حکم کی دیر۔ پرسوں وہ حاضر ہوئے مثل پیش ہوئی۔ حاکم نے پوچھا: حافظ محمد بخش کون؟ عرض کیا کہ میں۔ پھر پوچھا حافظ ممو کون؟ عرض کیا کہ میں۔ اصل نام میرا محمد بخش ہے، ممو ممو مشہور ہوں۔ فرمایا، یہ کچھ بات نہیں۔ حافظ محمد بخش بھی تم، حافظ ممو بھی تم، جو دنیا میں ہے وہ بھی تم۔ ہم مکان کس کو دیں؟ مثل داخل دفتر ہوئی، میاں ممو اپنے گھر چلے آئے۔"

[خطوط غالب، صفحہ ۴۰۵]

"اے لو، کئی دن ہوئے حمید خاں گرفتار آیا ہے۔ پاؤں میں بیڑیاں، ہاتھوں میں ہتھکڑیاں، حوالات میں ہیں۔ دیکھیے حکم اخیر کیا ہو۔ صرف نوندرائے کی مختارکاری پر قناعت کی گئی۔ جو کچھ ہونا ہے وہ ہو کر رہے گا ہر شخص کی سرنوشت کے مطابق حکم ہو رہے ہیں۔ نہ کوئی قانون ہے، نہ قاعدہ ہے، نہ نظیر کام آئے، نہ تقریر پیش جائے۔"

[خطوط غالب، صفحہ ۴۰۶]

"زنہار کبھی یہ گمان نہ کیجیے گا کہ دلی کی عملداری میرٹھ اور آگرہ اور بلاد شرقیہ کی شکل ہے۔ یہ پنجاب احاطہ میں شامل ہے۔ نہ قانون نہ آئین۔ جس حاکم کی جو رائے میں آوے، وہ ویسا ہی کرے"۔

[خطوط غالب، صفحہ ۴۷۶]

غالب کے اشک غم کی جھلک یوں تو علائی، تفتہ اور مجروح کے نام خطوط میں جا بجا ملتی ہے لیکن یوسف مرزا کے نام مندرجہ ذیل خط میں انھوں نے جس طرح اپنے ذاتی اور اجتماعی غم کی روداد بیان کی ہے، اس سے ان کے داخلی جذبات و احساسات پوری طرح منعکس ہیں۔ ہر حالت

میں خوش رہنے اور زندہ دلی کا احساس دلانے والا غالب ہجومِ غم کے سامنے سپر انداز تو نہیں ہوتا، لیکن شدّتِ کرب سے تڑپ ضرور اُٹھتا ہے:

کیوں گردشِ مدام سے گھبرا نہ جائے دل
انسان ہوں، پیالہ و ساغر نہیں ہوں میں

''یوسف مرزا، میرا حال سوائے میرے خدا اور خداوند کے کوئی نہیں جانتا۔ آدمی کثرتِ غم سے سودائی ہو جاتے ہیں، عقل جاتی رہتی ہے۔ اگر اس ہجومِ غم میں میری قوتِ متفکرہ میں فرق آ گیا ہو تو کیا عجب ہے، بلکہ اس کا باور نہ کرنا غضب ہے۔ پوچھو کہ غم کیا ہے؟ غم مرگ، غمِ فراق، غمِ رزق، غمِ عزّت۔ غمِ مرگ میں قلعہ نامبارک اسے قطع نظر کر کے اہلِ شہر کو گنتا ہوں: مظفر الدولہ، میر ناصر الدین، میرزا عاشور بیگ، میرا بھانجا، اس کا بیٹا احمد میرزا، انیس برس کا بچہ، مصطفیٰ خان ابن اعظم الدولہ، اس کے دو بیٹے ارتضیٰ خاں اور مرتضیٰ خاں، قاضی فیض اللہ، کیا میں ان کو اپنے عزیزوں کے برابر نہیں جانتا تھا؟ اے لو، بھول گیا۔ حکیم رضی الدین احمد خان، میر احمد حسین میکش، اللہ اللہ ان کو کہاں سے لاؤں؟ غمِ فراق حسین میرزا، میر مہدی، میر سرفراز حسین، میرن صاحب، خدا ان کو جیتا رکھے۔ کاش یہ ہوتا کہ جہاں ہوتے، وہاں خوش ہوتے! گھر ان کے بے چراغ، وہ خود آوارہ۔ سجاد اور اکبر کے حال کا جب تصور کرتا ہوں، کلیجہ ٹکڑے ٹکڑے ہوتا ہے۔ کہنے کو ہر کوئی ایسا کہہ سکتا ہے، مگر میں علی کو گواہ کر کے کہتا ہوں کہ ان اموات کے غم میں اور زندوں کے فراق میں عالم میری نظر میں تیرہ و تار ہے۔

حقیقی میرا ایک بھائی دیوانہ مر گیا۔ اس کی بیٹی، اس کے چار بچے، اس کی ماں یعنی میری بھاوج، جے پور میں پڑے ہوئے ہیں۔ اس تین برس میں ایک روپیہ ان کو نہیں بھیجا۔ بھتیجی کیا کہتی ہوگی کہ میرا بھی کوئی چچا ہے۔ یہاں اغنیا اور امرا کی ازواج اور اولاد بھیک مانگتے پھریں اور میں دیکھوں! اس مصیبت کی تاب لانے کو جگر چاہیے۔

(۱) لال قلعے کو مبارک کہتے تھے۔ اس کے حوادث کی وجہ سے غالب کو پے در پے رنج پہنچے تو شدتِ غم میں اسے ''نامبارک'' کہہ دیا۔ (بحوالہ خطوطِ غالب، مرتبہ مہر صفحہ ۴۱۱)

اب خاص اپنا دکھ روتا ہوں۔ ایک بیوی، دو بچے، تین چار آدمی گھر کے، کلو، کلیان، ایاز، یہ باہر مداری کی جورو بچے بدستور، گویا مداری موجود ہے۔ میاں گھمسن گئے گئے مہینہ بھر سے آ گئے کہ بھوکا مرتا ہوں۔ اچھا بھائی تم بھی رہو۔ ایک پیسے کی آمد نہیں، بیس آدمی روٹی کھانے والے موجود۔ مقام معلوم[1] سے کچھ آئے جاتا ہے۔ وہ بقدر سد رمق ہے۔ محنت وہ ہے کہ دن رات میں فرصت کام سے کم ہوتی ہے۔ ہمیشہ ایک فکر برابر چلی جاتی ہے۔ آدمی ہوں، دیو نہیں، بھوت نہیں، ان رنجوں کا تحمل کیوں کر کروں؟"

[۲۸ نومبر ۱۸۵۹ء/۲ جمادی الاول ۱۲۷۶ھ]

ذاتی اور اجتماعی ماحول کے اس دکھ ساگر میں سانس لیتے ہوئے بھی غالب نے اگر خوش طبعی کے دیپ جلائے، تو یہ بڑے حوصلے کی بات ہے!

---

(۱) رام پور

حصّہ سوئم

انتخاب خطوطِ غالب

نواب امین الدین احمد خان
(۱)

بھائی صاحب!

ساٹھ برس سے ہمارے تمھارے بزرگوں میں قرابتیں بہم پہنچیں۔ نج کا میرا تمھارا معاملہ یہ کہ پچاس برس سے تم کو چاہتا ہوں، بے اس کے کہ چاہت تمھاری طرف سے بھی ہو۔ چالیس برس سے محبت کا ظہور طرفین سے ہوا۔ مَیں تمھیں چاہتا رہا، تم مجھے چاہتے رہے۔ وہ امر عام اور یہ امر خاص، کیا مقتضی اس کا نہیں کہ مجھ میں تم میں حقیقی بھائیوں کا سا اخلاص پیدا ہو جائے؟ وہ قرابت اور یہ مودت کیا پیوند خون سے کم ہے۔ تمھارا یہ حال سنوں اور بے تاب نہ ہو جاؤں اور وہاں نہ آؤں؟ مگر کیا کروں، مبالغہ نہ سمجھو، مَیں ایک قالب بے روح ہوں:

یکے مردہ شخصم بمردی رواں

اضمحلال روح کا روز افزوں ہے۔ صبح کو تبرید، قریب دوپہر کے روٹی، شام کو شراب۔ اگر اس میں سے جس دن ایک چیز اپنے وقت پر نہ ملی، مَیں مرگیا۔ واللہ نہیں آ سکتا، باللہ نہیں آ سکتا۔ دل کی جگہ میرے پہلو میں پتھر بھی تو نہیں۔ دوست نہ سہی، دشمن بھی تو نہ ہوں گا۔ محبت نہ سہی عداوت بھی تو نہ ہوگی۔ آج تم دونوں بھائی[۱] اس خاندان میں شرف الدولہ اور فخر الدولہ[۲] کی جگہ ہو۔ میں لم یلد ولم یولد ہوں۔

میری زوجہ[۳] تمھاری بہن، میرے بچے[۴] تمھارے بچے ہیں۔ خود جو میری حقیقی بھتیجی ہے، اس کی اولاد بھی تمھاری اولاد[۵] ہے۔ نہ تمھارے واسطے بلکہ ان بے کسوں کے واسطے تمھارا دعا گو ہوں اور تمھاری سلامتی چاہتا ہوں۔ تمنا یہ ہے اور انشاء اللہ تعالیٰ ایسا ہی ہوگا، کہ تم جیتے رہو

حوالوں کی تشریح کے لیے دیکھیے آخر میں صفحہ ۱۹۱ تا ۱۹۴

اور تم دونوں کے سامنے مَیں مر جاؤں، تا کہ اس قافلہ کو اگر روٹی نہ دو گے، چنے تو دو گے اور اگر چنے بھی نہ دو گے اور بات نہ پوچھو گے تو میری بلا سے۔ مَیں تو موافق اپنے تصور کے مرتے وقت ان فلک زدوں کے غم میں نہ اُلجھوں گا۔

جناب والدۂ ماجدۂ تمھاری یہاں آنا چاہتی ہیں اور ضیاء الدین احمد خاں اسی واسطے وہاں پہنچتے ہیں۔ سنو، بعد تبدیل آب و ہوا و فائدے اور بھی بہت بڑے ہیں۔ کثرت اطباء، صحبت احباء، تنہائی سے نہ ملول رہو گے، حرف و حکایت میں مشغول رہو گے۔ آؤ آؤ، شتاب آؤ بھائی۔

میرزا علاؤ الدین خاں؟! تم کو کیا لکھوں؟ جو وہاں تمھارے دل پر گزرتی ہو گی یہاں میری نظر میں ہے۔ خیر دعائے مزید عمر و دولت۔

نجات کا طالب، غالب

(۲)

اخ مکرم کے خدام کرام کی خدمت میں بعد ابداء سلام مسنون، ملتمس ہوں، تمھارا شہر میں رہنا موجب تقویت دل تھا۔ گو نہ ملتے تھے، پر ایک شہر میں تو رہتے تھے۔

بھائی، ایک سیر دیکھ رہا ہوں۔ کئی آدمی طیور آشیاں گم کردہ کی طرح ہر طرف اڑتے پھرتے ہیں۔ ان میں سے دو چار بھولے بھٹکے کبھی یہاں بھی آ جاتے ہیں۔ لو صاحب، اب وعدہ کب وفا کرو گے؟ علائی کو کب بھیجو گے؟ ابھی تو شب کے چلنے اور دن کے آرام کرنے کے دن ہیں۔ بارش شروع ہو جائے گی تو آپ کی اجازت بھی کام نہ آئے گی۔ چلنے والا کہے گا: میں رہرو چالاک ہوں، تیراک نہیں۔ لوہارو سے دہلی تک کشتی بغیر کیوں کر جاؤں؟ دخانی جہاز کہاں سے لاؤں؟

اے ز فرصت بے خبر در ہر چہ باشی زود باش

استاد میر جان صاحب کو سلام۔

یوم الخمیس ۱۷۔ محرم ۱۲۸۱ھ — علائی کے دیدار کا طالب

(۲۲۔ جون ۱۸۶۴ء) — غالب

(۳)

برادر صاحب جمیل المناقب عمیم الاحسان، سلامت!

تمھاری تفریح طبع کے واسطے ایک غزل نئی لکھ کر بھیجی ہے، خدا کرے پسند آئے اور مطرب کو سکھائی جائے۔

آج شہر کے اخبار لکھتا ہوں۔ سوانح لیل و نہار لکھتا ہوں۔ کل پنج شنبہ ۲۵ مئی کو اول روز بڑے زور کی آندھی آئی۔ پھر خوب مینہ برسا۔ وہ جاڑا پڑا کہ شہر کرۂ زمہریر ہو گیا۔ بڑے دریبہ کا دروازہ ڈھایا گیا۔ قابل عطار کے کوچے کا بقیہ مٹایا گیا۔ کشمیری کٹرے کی مسجد زمین کا پیوند ہو گئی۔ سڑک کی وسعت دو چند ہو گئی۔ اللہ اللہ گنبد مسجدوں کے ڈھائے جاتے ہیں اور ہنود کی ڈیوڑھیوں کی جھنڈیوں کے پرچم لہراتے ہیں۔ ایک شیر زور آور اور پیل تن بندر پیدا ہوا ہے۔ مکانات جا بجا ڈھاتا پھرتا ہے۔ فیض اللہ خان بنگش کی حویلی پر گولہ ستے ہیں، جن کو عوام گمری کہتے ہیں، انھیں ہلا ہلا کر ایک ایک کی بنیاد ڈھا دی، اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ واہ رے بندر، یہ زیادتی اور پھر شہر کے اندر! ریگستان کے ملک سے ایک سردار زادۂ کثیر العیال عسیر الحال عربی، فارسی، انگریزی تین زبانوں کا عالم دتی میں وارد ہوا۔ بلی ماروں کے محلے میں ٹھہرا ہے۔ بحسب ضرورت حکام شہر سے مل لیتا ہے، باقی گھر کا دروازہ بند کیے بیٹھا رہتا ہے۔ گاہ گاہ، نہ ہر شام و پگاہ، غالب علی شاہ درویش کے تکیے پر آ جاتا ہے۔ اہل شہر حیران ہیں کہ کھاتا کہاں سے ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ باپ سے پھر گیا ہے، نہیں جانتا ہوں کہ بے سبب باپ کی نظر سے گر گیا ہے۔ دیکھیے انجام کار کیا ہو۔ غالب علی شاہ کا قول یہ ہے کہ کل کا بھلا ہو۔

جمعہ ۲۶ مئی ۱۸۶۵ء

علاؤالدین احمد خاں علائی

(۴)

صاحب! میری داستان سنیے۔ پنسن بے کم و کاست جاری ہوا۔ زر جمعہ سہ سالہ یکمشت مل گیا۔ بعد ادائے حقوق چار سو روپے دینے باقی رہے اور ستاسی روپے گیارہ آنے مجھے بچے۔ مئی کا مہینہ بدستور ملا، آخر جون میں حکم ہو گیا کہ پنسن دار علی العموم ششماہی پایا کریں۔ ماہ

بماہ پنسن تقسیم نہ ہوا کرے۔

میں دس بارہ برس سے حکیم محمد حسن خان کی حویلی میں رہتا ہوں۔اب وہ حویلی غلام اللہ خان نے مول لے لی۔ آخر جون میں مجھ سے کہا کہ حویلی خالی کر دو۔اب مجھے فکر پڑی کہ کہیں دو حویلیاں قریب ہمد گر ایسی ملیں کہ ایک محلسرا اور ایک دیوان خانہ ہو۔نہ ملیں۔ناچار یہ چاہا کہ بلّی ماروں میں ایک مکان ایسا ملے کہ جس میں جا رہوں۔نہ ملا۔تمھاری چھوٹی پھوپی نے بے کس نوازی کی ،کڑوڑا والی حویلی مجھ کو رہنے کو دی۔ہر چند وہ رعایت مرعی نہ رہی کہ محل سرا سے قریب ہو۔مگر خیر، بہت دُور بھی نہیں۔کل یا پرسوں وہاں جا رہوں گا۔ایک پانو زمین پر ہے ،ایک پانو رکاب میں۔تو شے کا دہ حال ،گوشے کی یہ صورت۔

کل شنبہ ۱۷۔ذی الحجہ کی اور ۷ جولائی کی ،پہر دن چڑھے تمھارا خط پہنچا۔دو گھڑی بعد سنا گیا کہ امین الدین خاں صاحب نے اپنی کوٹھی میں نزول اجلال کیا۔پہر دن رہے از راہ مہربانی ناگاہ میرے پاس تشریف لائے۔میں نے ان کو دُبلا اور افسردہ پایا۔دل گوحاعلی حسین خاں بھی آیا،اس سے بھی ملا۔میں نے تمھیں پوچھا کہ وہ کیوں نہیں آئے۔بھائی صاحب ؟بولے کہ جب میں یہاں آیا تو کوئی وہاں بھی تو رہے اور اس سے علاوہ وہ اپنے بیٹے کو بہت چاہتے ہیں۔میں نے کہا اتنا ہی جتنا تم اس کو چاہتے تھے؟ ہنسنے لگے۔غرض کہ میں نے بظاہر اُن کو تم سے اچھا پایا۔آگے تم لوگوں کے دلوں کا مالک اللہ ہے۔

نگاشتہ و رواں داشتہ یک شنبہ بین الظہر والعصر

۱۸۔ذی الحجہ ۱۲۷۶ھ (۸۔جولائی ۱۸۶۰ء) راقم ،غالب

(۵)

مولانا نسیمی!

کیوں خفا ہوتے ہو؟ ہمیشہ سے اسلاف ،اخلاف ہوتے چلے آئے ہیں۔اگر تیرا خلیفہ اول ہے (تو) تم خلیفہ ثانی ہو۔اس کو عمر میں تم پر تقدم ،زمانی ہے۔جانشین دونوں ،مگر ایک اوّل اور ایک ثانی ہے۔

شیر اپنے بچوں کو شکار کا گوشت کھلاتا ہے۔طریق صید افگنی سکھاتا ہے۔جب وہ جوان

ہو جاتے ہیں۔ آپ شکار کر کھاتے ہیں۔ تم سخنور ہو گئے۔ حسن طبع خداداد رکھتے ہو۔ ولادت فرزند کی تاریخ کیوں نہ کہو؟ اسم تاریخی کیوں نہ نکالو کہ مجھ پیر غم زدہ دل کو تکلیف دو؟ علاؤالدین خاں، تیری جان کی قسم میں نے پہلے لڑکے کا اسم تاریخی نظم کر دیا تھا اور وہ لڑکا نہ جیا۔ مجھ کو اس وہم نے گھیرا ہے کہ میری نحوست طالع کی تاثیر تھی۔ میرا ممدوح جیتا نہیں۔ نصیر الدین حیدر اور امجد علی شاہ ایک ایک قصیدے میں چل دئے۔ واجد علی شاہ تین قصیدوں کے متحمل ہوئے۔ پھر نہ سنبھل سکے۔ جس کی مدح میں دس بیس قصیدے کہے گئے وہ عدم سے بھی پرے پہنچا۔ نہ صاحب، دہائی خدا کی میں نہ تاریخ ولادت کہوں گا، نہ نام تاریخی ڈھونڈوں گا۔ حق تعالیٰ تم کو اور تمھاری اولاد کو سلامت رکھے اور عمر و دولت و اقبال عطا کرے۔

سنو صاحب، حسن پرستوں کا ایک قاعدہ ہے، وہ امرد کو دو چار برس گھٹا کر دیکھتے ہیں۔ جانتے ہیں کہ جوان ہے، لیکن بچہ سمجھتے ہیں۔ یہ حال تمھاری قوم کا ہے۔ قسم شرعی کھا کر کہتا ہوں کہ ایک شخص ہے کہ اس کی عزت اور نام آوری جمہور کے نزدیک ثابت اور متحقق ہے اور صاحب، تم بھی جانتے ہو، مگر جب تک اس سے قطع نظر نہ کرو اور اس مسخرے کو گمنام و ذلیل نہ سمجھ لو تم کو چین نہ آئے گا۔ پچاس برس سے دلی میں رہتا ہوں۔ ہزار ہا خط اطراف و جوانب سے آتے ہیں۔ بہت لوگ ایسے ہیں کہ محلہ سابق کا نام لکھ دیتے ہیں۔ حکام کے خطوط فارسی و انگریزی، یہاں تک کہ ولایت کے آئے ہوئے، صرف شہر کا نام اور میرا نام۔ یہ سب مراتب تم جانتے ہو، ان خطوط کو تم دیکھ چکے ہو اور پھر مجھ سے پوچھتے ہو کہ اپنا مسکن بتا۔ اگر میں تمھارے نزدیک امیر نہیں، نہ سہی، اہل حرفہ میں سے بھی نہیں ہوں کہ جب تک محلہ اور تھانہ نہ لکھا جائے ہرکارہ میرا پتہ نہ پائے۔ آپ صرف دہلی لکھ کر میرا نام لکھ دیا کیجئے خط پہنچنے کا میں ضامن۔

پنج شنبہ ۲۴ ماہ اپریل ۱۸۶۱ع　　　　　غالب

(۲)

جان غالب!

یاد آتا ہے کہ تمھارے عم نامدار! سے سنا تھا کہ لغات ''دساتیر'' کی فرہنگ وہاں ہے۔ اگر ہوتی تو کیوں نہ بھیج دیتے۔ خیر:

آنچہ ما در کار داریم اکثرے درکار نیست

تم شمر نورس ہو اس نہال کے کہ جس نے میری آنکھوں کے سامنے نشو و نما پائی ہے اور میں ہوا خواہ و سایہ نشیں اس نہال کا رہا ہوں۔ کیونکر تم مجھ کو عزیز نہ ہو گے؟ رہی دید وا دید اس کی دو صورتیں ہیں۔ تم دلی میں آ دیا ئیں لوہارو آؤں۔ تم مجبور، مَیں معذور۔ خود کہتا ہوں کہ میرا عذر زنہار مسموع نہ ہو، جب تک نہ سمجھ لو کہ مَیں کون ہوں اور ماجرا کیا ہے۔

سنو، عالم دو ہیں: ایک عالم ارواح اور ایک عالم آب و گل۔ حاکم ان دونوں عالموں کا وہ ایک ہے جو خود فرماتا ہے: لمن الملک الیوم؟ اور پھر آپ جواب دیتا ہے: للہ الواحد القہار۔ ہر چند قاعدۂ عام یہ ہے کہ عالم آب و گل کے مجرم عالم ارواح میں سزا پاتے ہیں۔ لیکن یوں بھی ہوا ہے کہ عالم ارواح کے گنہگار کو دنیا میں بھیج کر سزا دیتے ہیں۔ چنانچہ میں آٹھویں رجب ۱۲۱۲ھ میں روبکاری کے واسطے یہاں بھیجا گیا[۲]۔ تیرہ برس حوالات میں رہا۔ ۷ رجب ۱۲۲۵ھ کو میرے واسطے حکم دوام حبس[۳] صادر ہوا۔ ایک بیڑی میرے پاؤں میں ڈال دی اور دلی شہر کو زنداں مقرر کیا اور مجھے اس زنداں میں ڈال دیا۔ فکر نظم و نثر کو مشقت ٹھہرایا۔ برسوں کے بعد میں جیل خانہ سے بھاگا۔ تین برس بلاد شرقیہ پھرتا رہا۔ پایان کار مجھے کلکتہ سے پکڑ لائے۔ پھر اسی محبس میں بٹھا دیا۔ جب دیکھا کہ یہ قیدی گریز پا ہے، دو ہتھکڑیاں اور بڑھا دیں۔ پانو بیڑی سے فگار، ہاتھ ہتھکڑیوں سے زخم دار۔ مشقت مقرری اور مشکل ہو گئی۔ طاقت یک قلم زائل ہو گئی۔ بے حیا ہوں۔ سال گزشتہ بیڑی کو زاویۂ زنداں میں چھوڑ مع دونوں ہتھکڑیوں[۴] کے بھاگا۔ میرٹھ، مراد آباد ہوتا ہوا رام پور پہنچا۔ کچھ دن کم دو مہینے وہاں رہا تھا کہ پھر پکڑا آیا۔ اب عہد کیا کہ پھر نہ بھاگوں گا۔ بھاگوں گا کیا؟ بھاگنے کی طاقت بھی تو نہ رہی۔ حکم رہائی دیکھئے[۵] کب صادر ہو۔ ایک ضعیف سا احتمال ہے کہ اس ماہ ذی الحجہ ۱۲۷۷ھ میں چھوٹ جاؤں۔ بہر تقدیر بعد رہائی کے تو آدمی سوائے اپنے گھر کے اور کہیں نہیں جاتا۔ مَیں بھی بعد نجات سیدھا عالم ارواح کو چلا جاؤں گا:

فرخ آں روز کہ از خانۂ زنداں بروم
سوے شہر خود ازیں وادیٔ ویراں بروم

ذی الحجہ ۱۲۷۷ھ (جون ۱۸۶۱ء) (غالب)

(۷)

علائی مولائی!

اس وقت تمھارا خط پہنچا۔ اُدھر پڑھا اِدھر جواب لکھا۔ واہ کیا کہنا ہے؟ رام پور کے علاقے کو گاؤ مشک اور مجھ کو بیل یا اس پیوند کے طعنے کو تازیانہ اور مجھ کو گھوڑا بنایا۔ وہ علاقہ اور وہ پیوند لوہارو کے سفر کا مانع و مزاحم کیوں ہو؟ رئیس کی طرف سے بطریق وکیل محکمہ کمشنری میں معین نہیں ہوں۔ جس طرح امرا واسطے فقرا کے وجہ معاش مقرر کر دیتے ہیں، اسی طرح اس سرکار سے میرے واسطے مقرر ہے۔ ہاں فقیر سے دعائے خیر اور مجھ سے اصلاح نظم مطلوب ہے۔ چاہوں دلّی رہوں، چاہوں اکبر آباد، چاہوں لاہور، چاہوں لوہارو۔ ایک گاڑی کپڑوں کے واسطے کروں۔ کپڑوں کے صندوق میں آدھی درجن شراب دھروں۔ آٹھ کہار ٹھیکے کے لوں۔ چار آدمی رکھتا ہوں۔ دو یہاں چھوڑوں، دو ساتھ لوں، چل دوں۔ رام پور سے جو لفافہ آیا کرے گا لڑکوں کا حافظ لوہارو بھجوایا کرے گا۔ گاڑی ہو سکتی ہے۔ شراب مل سکتی ہے۔ کہار بہم پہنچ سکتے ہیں۔ طاقت کہاں سے لاؤں؟ روٹی کھانے کو باہر کے مکان سے محلسرا میں کہ وہ بہت قریب ہے، جب جاتا ہوں تو ہندوستانی گھڑی بھر میں دم ٹھہرتا ہے اور یہی حال دیوان خانے میں آ کر ہوتا ہے۔ والی رام پور نے بھی تو مرشد زادہ کی شادی میں بلایا تھا۔ یہی لکھا گیا کہ میں اب معدوم محض ہوں تمھارا اقبال تمھارے کلام کو اصلاح دیتا ہے۔ اس سے بڑھ کر مجھ سے خدمت نہ چاہو۔

بھائی کے اور تمھارے دیکھنے کو جی بہت چاہتا ہے۔ پر کیا کروں؟ عقرب و قوس کے آفتاب یعنی نومبر دسمبر میں قصد تو کروں گا۔ کاش لوہارو کی جگہ گوڑ گانوہ ہوتا یا بادشاہ پور ہوتا۔ کہو کے کہ رام پور کیا نزدیک ہے؟ وہاں گئے کو دو برس ہو گئے۔ یہاں انحطاط و اضمحلال روز افزوں۔ نہ تم یہاں آ سکتے ہو۔ نہ مجھ میں وہاں آنے کا دم۔ بس اگر نومبر دسمبر میں میرا اخیر حملہ چل گیا، بہتر، ورنہ:

اے وائے ز محرومی دیدار و دگر ہیچ

چہار شنبہ ۲۵ ستمبر ۱۸۶۱ع۔ ہنگام نیمروز غالب

(۸)

میری جان! کیا کہتے ہو؟ کیا چاہتے ہو؟ ہوا ٹھنڈا ہو گیا۔ پانی ٹھنڈی ہو گئی۔ فصل اچھی ہو گئی۔ اناج بہت پیدا ہو گیا۔ توقیع جانشینی مجھ سے تم کو پہنچا۔ خرقہ پایا۔ سجہ وسجادہ کا یہاں پتہ نہیں، ورنہ وہ بھی عزیز نہ رکھتا۔ اس سے بڑھ کر یہ کہ بھائی نے شفا پائی۔ استاد میر جان پہنچ گئے۔ آخر اکتوبر میں یا آغاز نومبر میں نیر رخشاں کو بھی وہیں لو۔ پھر عقرب وقوس کے آفتاب کا کیا ذکر؟ آبان ماہ وآذر ماہ سے کیا غرض؟

بے تیر و دے ماہ و ارادی بہشت   بر آید کہ ما خاک باشیم و خشت

استاد میر جان کو، اس راہ سے کہ میری پھوپھی ان کی چچی تھیں اور یہ مجھ سے عمر میں چھوٹے ہیں، دعا، اور اس رو سے کہ دوست ہیں اور دوستی میں کمی بیشی سن وسال کی رعایت نہیں کرتے، سلام، اور اس سبب سے کہ استاد کہلاتے ہیں، بندگی، اور اس نظر سے کہ یہ سید ہیں، درود اور موافق مضمون اس مصرع کے:

سوئے   اللہ   واللہ،   ما   فی   الوجود

سجود!

حضرت وہ ''شرف نامہ'' نہیں ہے، کسی احمق نے شرف نامہ میں سے کچھ لغات، اکثر غلط، کمتر صحیح، چن کر جمع کیے ہیں۔ نہ دیباچہ ہے کہ اس سے جامع کا حال معلوم ہو، نہ خاتمہ ہے کہ عہد وعصر کا حال کھلے۔ بایں ہمہ میاں ضیاء الدین کے پاس ہے۔ اگر وہ آجائیں گے تو ان سے کہہ دوں گا۔ اگر وہ لائیں گے تو ان کو قیمت دے کر علائی مولائی کو بھیج دوں گا۔

خصی بکروں کے گوشت کے قلیے، دو پیازے، پلاؤ، کباب جو کچھ تم کھا رہے ہو مجھ کو خدا کی قسم اگر اس کا کچھ خیال بھی آتا ہو۔ خدا کرے، بیکانیر کی مصری کا ٹکڑا تم کو میسر نہ آیا ہو۔ کبھی یہ تصور کرتا ہوں کہ میر جان صاحب اس مصری کے ٹکڑے چبا رہے ہوں گے تو یہاں میں رشک سے اپنا کلیجہ چبانے لگتا ہوں۔

سہ شنبہ ۱۵ اکتوبر ۱۸۶۱ء   نجات کا طالب، غالب

(۹)

صاحب!

کل تمھارے خط کا جواب بھیج چکا ہوں، پہنچ چکا ہوگا۔ آج صبح کو بھائی صاحب کے پاس گیا۔ بھائی ضیاء الدین خاں اور بھائی شہاب الدین خاں بھی وہیں تھے۔ مولوی صدرالدین میرے سامنے آئے۔ حکیم محمود خاں کے طور پر معالجہ قرار پایا ہے۔ یعنی انھوں نے نسخہ لکھ دیا ہے۔ سو اس کے موافق حبوب بن گئی ہیں۔ نقوع کی دوائیں آج آ کر بھیگیں گی۔ کل حبوب کے اوپر وہ نقوع پیا جائے، مگر انداز و ادا سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ابھی حضرت مریض کی اور ان کے ہوا خواہوں کی رائے میں قصد اس استعلاج کا مذبذب ہے۔ نسخے کی حقیقت کو میزان نظر میں تول رہے ہیں۔ استاد میر جان بھی تھے۔ نیم نامعقول مرزا اسد بیگ بھی تھے۔ سب طرح خیریت ہے۔

کل تمھارے خط میں دوبار یہ کلمہ مرقوم دیکھا کہ دتی بڑا شہر ہے۔ ہر قسم کے آدمی وہاں بہت ہوں گے۔ اے میری جان! یہ وہ دلی نہیں، جس میں تم پیدا ہوئے ہو۔ وہ دتی نہیں جس میں تم نے علم تحصیل کیا۔ وہ دتی نہیں جس میں تم شعبان بیگ کی حویلی میں مجھ سے پڑھنے آیا کرتے تھے۔ وہ دتی نہیں جس میں اکیاون برس سے مقیم ہوں۔ ایک کمپ ہے۔ مسلمان، اہل حرفہ یا حکام کے شاگرد پیشہ، باقی سراسر ہنود۔ معزول بادشاہ کے ذکور، جو بقیۃ السیف ہیں وہ پانچ پانچ روپے مہینہ پاتے ہیں۔ اناث میں سے جو پیرزن ہیں کٹنیاں اور جو جوان ہیں کسبیاں۔ امرائے اسلام میں سے اموات گنو: حسن علی خان[1] بہت بڑے باپ کا بیٹا، سو روپے روز کا پنسن دار، سو روپے مہینہ کا روزینہ خوار بن کر نامرادانہ مر گیا۔ میر نصیر الدین[2] باپ کی طرف سے پیرزادہ، نانا اور نانی کی طرف سے امیر زادہ، مظلوم مارا گیا۔ آغا سلطان، بخشی محمد علی خاں کا بیٹا، جو خود بھی بخشی ہو چکا ہے، بیمار پڑا۔ نہ دوا، نہ غذا، انجام کار مر گیا۔ تمھارے چچا کی سرکار سے تجہیز و تکفین ہوئی۔ احبا کو پوچھو، ناظر حسین مرزا، جس کا بڑا بھائی مقتولوں میں آیا۔ اس کے پاس ایک پیسہ نہیں۔ ٹکے کی آمد نہیں۔ مکان اگرچہ رہنے کو مل گیا ہے، مگر دیکھئے کہ چھٹا رہے یا ضبط ہو جائے۔ بڈھے صاحب[3] ساری املاک بیچ کر، نوش جان کر کے، بیک بینی و دو گوش بھرت پور چلے گئے۔ ضیاء الدولہ کی

پانسو روپے کرائے کی املاک داگزاشت ہو کر پھر قرق ہو گئی۔ تباہ و خراب لاہور گیا۔ وہاں پڑا ہوا ہے۔ دیکھئے کیا ہوتا ہے۔ قصہ کوتاہ قلعہ اور جھجراور بہادر گڑھ اور بلب گڈھ اور فرخ نگر کم وبیش تیس لاکھ روپے کی ریاستیں مٹ گئیں۔ شہر مند آدمی یہاں کیوں پایا جائے؟ جو حکماء کا حال لکھا ہے۔ وہ بیان واقع ہے۔ صلحا اور زہاد کے باب میں جو حرف مختصر میں نے لکھا ہے، اس کو بھی سچ جانو۔ اپنے والد ماجد کی طرف سے خاطر جمع رکھو۔ سحر، آسیب کا گمان ہرگز نہ کرو۔ خدا چاہے تو استعمال ایار جات کے بعد بالکل اچھے ہو جائیں گے اور اب بھی خدا کے فضل سے اچھے ہیں۔

یک شنبہ، ۱۶۔ فروری ۱۸۶۲ء عافیت کا طالب، غالب

(۱۰)

یار بھتیجے، گویا بھائی، مولانا علائی! خدا کی دہائی، نہ میں ویسا ہوں گا جیسا تیر سمجھا اور تم مجھ کو لکھ چکے ہو یعنی خفقانی اور خیال تراش، نہ ویسا ہوں گا جیسا مرزا علی حسین خاں بہادر سمجھے ہوں گے:

اے کاش کسے ہر آنچہ ہستم ، داند

دوجانہ میں میرا انتظار اور میرے آنے کا تقریب شادی پر مدار، یہ بھی شعبہ ہے انھیں ظنون کا، جن سے تمھارے چچا کو گمان ہے مجھ پر جنون کا۔ جاگیر دار میں نہ تھا کہ ایک جاگیر دار مجھ کو بلاتا۔ گویا نہ تھا کہ اپنا ساز و سامان لے کر چلا جاتا۔ دوجانہ جا کر شاگردی کماؤں اور پھر اس فصل میں کہ دنیا کز و نار ہو، لوہارو بھائی کے دیکھنے کو نہ جاؤں اور پھر اس موسم میں کہ جاڑے کی گری بازار ہو؟

کل استاد میر جان صاحب نے تمھارا خط مجھ کو دکھایا ہے۔ مَیں نے ان کو جانے نہ جانے میں متردد پایا ہے۔ جائیں نہ جائیں، مَیں اپنی طرف سے ترغیب کرتا رہتا ہوں اور کہتا رہوں گا۔ غلام حسن خاں اگر کسی وقت آ جائیں گے تو ان کو تمھاری تحریر کا خلاصہ خاطر نشان کر دوں گا۔ حق سبحانہ تعالیٰ ان دونوں صاحبوں کو یا ایک کو ان میں سے توفیق دے یا مجھ کو طاقت یا تم کو انصاف کہ میرے نہ آنے کو دتی کی دل بستگی پر محمول نہ کرو۔ مجھ کو رشک ہے جزیرہ نشینوں کے حال پر اور رئیس فرخ آباد پر خصوصاً کہ جہاز سے اُتار کر سرزمین عرب میں چھوڑ دیا۔ اہا ہا ہا!

پڑیے گر بیمار تو کوئی نہ ہو تیمار وار
اور اگر مر جایئے تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو

کلیات ۳ کے انطباع کا اختتام اپنی زیست میں مجھ کو نظر نہیں آتا۔ قاطع برہان کا چھاپا تمام ہوگیا۔ حق التصنیف کی ایک جلد میرے پاس آگئی۔ وہ تمھارے عم نامدار ۴ کی نذر ہوئی۔ باقی جلدیں، جن کا میں خریدار ہوا ہوں اور درخواست میری مطبع میں داخل ہے؛ جب تک قیمت نہ بھیج دوں، کیوں کر آئیں؟ روپے کی تدبیر میں ہوں۔ اگر بہم پہنچ جائے تو بھیج دوں۔ تمھارے پاس جو ''قاطع برہان'' پہنچی ہے، اگر چھاپے کی ہے تو صحیح ہے۔ جہاں تردد ہو غلط نامہ ملحقہ میں دیکھ لو۔ زیادہ انکشاف منظور ہو مجھ سے پوچھ لو۔ اگر قلمی ہے تو درجۂ اعتبار سے ساقط ہے۔ اس کو میری تالیف نہ سمجھو، بلکہ مجھ کو مول لے لو اور اس کو پھاڑ ڈالو۔ آج یوم الخمیس ۱۹۔ جون المبارک بارہ پر تین بجے تمھارا خط آیا۔ اُدھر پڑھا اِدھر جواب لکھنے بیٹھا۔ یہاں تک لکھ چکا تھا کہ شیخ شہاب الدین سہروردی ۵ آئے تمھارا خط ان کو دیا، وہ پڑھ رہے ہیں، ہم لکھ رہے ہیں، ہوا سرد چل رہی ہے۔

۱۹ جون ۱۸۶۲ء (غالب)

(۱۱)

میری جان!

سُن، پنجشنبہ پنجشنبہ آٹھ، جمعہ نو، ہفتہ دس، اتوار گیارہ، ایک مژہ برہم زدن مینہ نہیں تھما۔ اس وقت بھی شدت سے برس رہا ہے۔ انگیٹھی میں کوئلے دہکا کر پاس رکھ لئے ہیں۔ دو سطریں لکھیں اور کاغذ کو آگ سے سینک لیا۔ کیا کروں؟ تمھارے خط کا جواب ضرور۔ لو سنتے جاؤ: مرزا شمشاد علی بیگ کو تمھارا خط پڑھوا دیا۔ انھوں نے کہا کہ غلام حسن خاں کی معیت پر کیا موقوف ہے، مجھے آج سواری مل جائے، کل چل نکلوں۔ اب میں کہتا ہوں کہ اونٹ ٹٹو کا موسم نہیں، گاڑی کی تدبیر ہو جائے بس۔

پچاس برس کی بات ہے کہ الٰہی بخش خاں مرحوم ۱ نے ایک زمین نئی نکالی۔ میں نے حسب الحکم غزل لکھی۔ بیت الغزل یہ:

پلا دے اوک سے ساقی جو ہم سے نفرت ہے
پیالہ گر نہیں دیتا ، نہ دے شراب تو دے

مقطع یہ ہے:

اسد خوشی سے مرے ہاتھ پانو پھول گئے
کہا جو اُس نے ذرا میرے پانو داب تو دے

اب مَیں دیکھتا ہوں کہ مطلع اور چار شعر کسی نے لکھ کر اس مقطع اور اس بیت الغزل کو شامل اُن اشعار کے کر کے غزل بنائی ہے اور اس کو لوگ گاتے پھرتے ہیں۔ مقطع اور ایک شعر میرا اور پانچ شعر کسی اُلو کے۔ جب شاعر کی زندگی میں گانے والے، شاعر کے کلام کو مسخ کردیں تو کیا بعید ہے کہ شاعر متوفی کے کلام میں مطربوں نے خلط کردیا ہو۔ مقطع بے شک مولانا مغربی کا ہے اور وہ شعر جو مَیں نے تم کو لکھا ہے اور یہ شعر جواب لکھتا ہوں:

دامان نگہ تنگ و گل حسن تو بسیار
گلچین بہار تو ز دامان گلہ دارد

یہ دونوں شعر قدسی کے ہیں۔ مغربی قدما میں اور عرفا میں ہے جیسا عراقی۔ ان کا کلام دقائق وحقائق تصوف سے لبریز۔ قدسی شاہجہانی شعرا میں صائب وکلیم کا ہم عصر اور ہم چشم۔ ان کا کلام شور انگیز۔ ان بزرگوں کی روش میں زمین وآسمان کا فرق۔

بھائی صاحب کو سلام کہنا اور کہنا کہ صاحب وہ زمانہ نہیں اِدھر متھرا داس سے قرض لیا اُدھر درباری مل کو مارا، اِدھر خوب چند چین سکھ کی کوٹھی جالُوٹی۔ ہر ایک کے پاس تمسک مُہری موجود، شہد لگاؤ، چاٹو، نہ مول، نہ سُود۔ اس سے بڑھ کر یہ بات کہ روٹی کا خرچ پھوپھی کے سر۔ بایں ہمہ کبھی خاں نے کچھ دے دیا، کبھی الور سے کچھ دلوا دیا، کبھی ماں نے آگرے سے بھیج دیا۔ اب مَیں اور باسٹھ روپے آٹھ آنے کلکٹری کے، سو روپے رام پور کے۔ قرض دینے والا ایک میرا مختار کار، وہ سود ماہ بماہ لیا چاہے۔ مول میں قسط اس کو دینی پڑے۔ انکم ٹیکس جدا، چوکیدار جدا، سود جدا، مول جدا، بی بی جدا، بچے جدا، شاگرد پیشہ جدا، آمد وہی ایک سو باسٹھ۔ تنگ آگیا۔ گزارہ

مشکل ہو گیا۔ روزمرہ کا کام بند رہنے لگا۔ سوچا کہ کیا کروں؟ کہاں سے گنجائش نکالوں؟ قہر درویش بجان درویش صبح کو تبرید متروک، چاشت کا گوشت آدھا، رات کو شراب وگلاب موقوف۔ بیس بائیس روپے مہینہ بچا، روزمرہ کا خرچ چلا۔ یاروں نے پوچھا: تبرید وشراب کب تک نہ پیو گے؟ کہا گیا کہ جب تک وہ نہ پلائیں گے۔ پوچھا: نہ پیو گے تو کس طرح جیو گے؟ جواب دیا کہ جس طرح وہ جلائیں گے۔ بارے مہینا پورا نہیں گزرا تھا کہ رام پور سے علاوہ وجہ مقرری اور روپیہ آ گیا۔ قرض مقسط ادا ہو گیا۔ متفرق رہا۔ خیر رہو۔ صبح کی تبرید، رات کی شراب جاری ہو گئی۔ گوشت پورا آنے لگا۔

چونکہ بھائی صاحب نے وجہ موقوفی اور بحالی کی پوچھی تھی۔ اُن کو یہ عبارت پڑھا دینا اور حمزہ خان کو بعد سلام کہنا:

اے بے خبر ز لذت شرب دوام ما

دیکھا؟ ہم کو یوں پلاتے ہیں۔ دریہ کے بنیوں اور لونڈوں کو پڑھا کر مولوی مشہور ہونا اور مسائل حیض ونفاس میں غوطہ مارنا اور ہے اور عرفا کے کلام سے حقیقت حقۂ وحدت وجود کو اپنے دل نشین کرنا اور ہے۔ مشرک وہ ہیں جو وجود کو واجب وممکن میں مشترک جانتے ہیں۔ مشرک وہ ہیں جو مسیلمہ کو نبوت میں خاتم المرسلینؐ کا شریک گردانتے ہیں۔ مشرک وہ ہیں جو نومسلموں کو ابوالائمہ کا ہمسر مانتے ہیں۔ دوزخ ان لوگوں کے واسطے ہے۔ مَیں موحد خالص اور مومن کامل ہوں۔ زبان سے لا الہ الا اللہ کہتا ہوں اور دل میں لا موجود الا اللہ، لا موثر فی الوجود الا اللہ سمجھے ہوا ہوں۔ انبیاء سب واجب التعظیم اور اپنے اپنے وقت میں سب مفترض الطاعت تھے۔ محمد علیہ السلام پر نبوت ختم ہوئی۔ یہ خاتم المرسلین اور رحمۃ للعالمین ہیں۔ مقطع نبوت کا مطلع امامت اور امامت نہ اجماعی، بلکہ من اللہ ہے اور امام من اللہ علی علیہ السلام ہے، ثم حسن، ثم حسین، اسی طرح تا مہدی موعود علیہ السلام:

بریں زیستم ہم بریں بگورم

ہاں اتنی بات اور ہے کہ اباحت اور زندقہ کو مردود اور شراب کو حرام اور اپنے کو عاصی سمجھتا ہوں۔ اگر مجھ کو دوزخ میں ڈالیں گے تو میرا جلانا مقصود نہ ہوگا۔ بلکہ دوزخ کا ایندھن ہوں گا

اور دوزخ کی آنچ کو تیز کروں گا تاکہ مشرکین و منکرین نبوت مصطفویؐ و امامت مرتضویؑ اس میں جلیں۔ سنو مولوی صاحب! اگر ہٹ دھرمی نہ کروگے اور کتمان حق کو گناہ جانو گے تو البتہ تم کو یاد ہو گا اور کہو گے کہ ہاں یاد ہے، جن روزوں میں تم علاؤالدین کو ''گلستان'' اور ''بوستان'' پڑھاتے ہو اور تم نے ایک دن غریب کو دو تین تپانچے مارے ہیں۔ نواب امین الدین خاں ان دنوں میں لوہارو ہیں۔ علاؤالدین خاں کی والدہ نے تم کو ڈیوڑھی پر سے اٹھا دیا۔ تم باچشم پرُ آب میرے پاس آئے۔ میں نے تم سے کہا کہ بھائی شریف زادوں کو اور سردار زادوں کو چشم نمائی سے پڑھاتے ہیں، مارتے نہیں۔ تم نے بے جا کیا۔ آئندہ یہ حرکت نہ کرنا۔ تم نادم ہوئے۔ اب وہ کتب نشیں طفل [۲] سے گزر کر پیر ہفتاد سالہ [۳] کے واعظ بنے۔ تم نے کئی فاقوں میں ایک شعر حافظ کا حفظ کیا ہے: چوں پیرشدی حافظ الخ [۴] اور پھر پڑھتے ہو اس کے سامنے کہ اس کی نظم کا دفتر حافظ کے دیوان سے دوچند سہ چند ہے۔ مجموعہ نثر جداگانہ اور یہ لحاظ بھی نہیں کرتے کہ ایک شعر حافظ کا یہ ہے اور ہزار شعر اس کے مخالف ہیں:

صوفی بیا کہ آئنہ صاف است جام را
تا بنگری صفائے مئے لعل فام را
شراب ناب خور و روئے مہ جبیناں بیں
خلاف مذہب آناں جمال ایناں بیں
ترسم کہ صرفۂ نبرد روز باز خواست
نان حلال شیخ ز آب حرام ما

ساقی مگر وظیفۂ حافظ ز بادہ داد　　کاشفتہ گشت طرۂ دستار مولوی

میاں میں بڑی مصیبت میں ہوں۔ محل سرا کی دیواریں گر گئی ہیں۔ پاخانہ ڈھے گیا ہے۔ چھتیں ٹپک رہی ہیں۔ تمھاری پھوپی کہتی ہیں: ہائے دبی، ہائے مری۔ دیوان خانے کا حال محل سرا سے بدتر ہے۔ میں مرنے سے نہیں ڈرتا، فقدانِ راحت سے گھبراتا ہوں۔ چھت چھلنی ہے۔ ابر دو گھنٹے برسے تو چھت چار گھنٹے برستی ہے۔ مالک اگر چاہے کہ مرمت کرے تو کیونکر کرے؟ مینہ

کھلے تو سب کچھ ہو اور پھر اثنائے مرمت میں میں بیٹھا کس طرح رہوں؟ اگر تم سے ہو سکے تو برسات تک بھائی سے مجھ کو وہ حویلی جس میں میر حسن رہتے تھے اپنی پھوپی کے رہنے کو اور کوٹھی میں سے وہ بالا خانہ مع دالان زیریں جوالٰہی بخش خاں مرحوم کا مسکن تھا میرے رہنے کو دلوادو۔ برسات گزر جائے گی مرمت ہو جائے گی پھر صاحب اور میم اور بابا لوگ اپنے قدیم مسکن میں آ رہیں گے۔ تمھارے والد کے ایثار و عطا کے جہاں مجھ پر احسان ہیں ایک یہ مروت کا احسان میرے پایان عمر میں اور بھی سہی۔

صبح یک شنبہ۔ ۲۸ جولائی ۱۸۶۲ء غالب

(۱۲)

مولانا علائی!

نہ مجھے خوف مرگ نہ دعوائے صبر ہے۔ میرا مذہب بخلاف عقیدہ قدریہ جبر ہے تم نے میاں جی گری کی بھائی نے برادر پروری کی۔ تم جیتے رہو۔ وہ سلامت رہیں۔ ہم اسی حویلی میں تا قیامت رہیں۔

اس ابہام کی توضیح اور اس کی اجمالی تفصیل یہ ہے کہ مینہ شدت سے برسا۔ چھوٹا لڑکا ڈرنے لگا۔ اس کی دادی بھی گھبرائی۔ مجھ کو خلوت خانے کا دروازہ غرب رویہ اس کے آگے ایک چھوٹا سا سہ دریا دیا تھا۔ جب تمھارے پانوں میں چوٹ لگی ہے تو میں اسی دروازے سے تم کو دیکھنے آیا تھا۔ یہ سمجھ کر خلوت خانے کو محل سرا بنایا چاہتا تھا کہ گاڑی ڈولی لونڈی اصیل کا چھن تیلن تنبولن کہاری پسنہاری ان فرقوں کا ممر وہ دروازہ رہے گا۔ میری اور میرے بچوں کی آمد و رفت دیوان خانہ میں سے رہے گی۔ عیاذاً باللہ! وہ لوگ دیوان خانہ میں سے آئیں جائیں۔ اپنے بیگانے کو ہر وقت پچھل پائیاں نظر آئیں۔[۲]

بی وفادار جن کو تم کچھ اور بھائی خوب جانتے ہیں اب تمھاری پھوپی نے انھیں "وفادار بیگ" بنا دیا ہے۔ باہر نکلتی ہیں سودا تو کیا لائیں گی مگر خلیق اور ملنسار ہیں۔ رستہ چلتوں سے باتیں کرتی پھرتی ہیں۔ جب وہ محل سے نکلیں گی ممکن نہیں کہ اطراف نہر کی سیر نہ کریں۔ ممکن نہیں کہ دروازے کے سپاہیوں سے باتیں نہ کریں۔ ممکن نہیں کہ پھول نہ توڑیں اور بی بی کو لے جا کر نہ

دکھائیں اور نہ کہیں کہ "یہ پھول تمارے چچا کے بیٹے کی کائی کے ہیں" (تمہارے چچا کے بیٹے کی کیاری کے ہیں) ہے ہے! ایسے عالی شان دیوان خانے کی یہ قسمت اور مجھ سے نازک مزاج دیوانے کی یہ شامت! معہذا اس سہ دری کو اپنے آدمیوں کے اور لڑکوں کے مکتب کے لئے ہرگز کافی نہ جانا۔ مور اور کبوتر اور دنبہ اور بکری باہر گھوڑوں کے پاس رہ سکتے تھے؟ عرفت ربی بفسخ العزائم پڑھا اور چپ ہو رہا۔ مگر تمہاری خاطر عاطر جمع رہے کہ اسباب وحشت وخوف وخطر نہ رہے۔ مینہ کھل گیا ہے۔ مکان کے مالکوں کی طرف سے مدد شروع ہو گئی ہے۔ نہ لڑ کا ڈرتا ہے نہ بی بی گھبراتی ہے۔ نہ میں بے آرام ہوں۔ کھلا ہوا کوٹھا' چاندنی رات' ہوا سرد' تمام رات فلک پر مریخ پیش نظر' دو گھڑی کے تڑکے زہرہ جلوہ گر۔ ادھر چاند مغرب میں ڈوبا' ادھر مشرق سے زہرہ نکلی۔ صبوحی کا وہ لطف' روشنی کا وہ عالم۔

۶ ماہ اگست ۱۸۶۲ء غالب

(۱۳)

میری جان! غالب کثیر المطالب کی کہانی سن۔ میں اگلے زمانے کا آدمی ہوں۔ جہاں ایک امر کی ابتدا دیکھی' یہ جان لیا کہ اب یہ امر مطابق اس ہدایت کے نہایت پذیر ہو گا۔ یہاں اختلاف طبائع کا وہ حال کہ آغاز مغشوش' انجام مخدوش۔ مبتدا خبر سے بیگانہ' شرط جزا سے محروم۔ سنا اور متواتر سنا کہ قصہ طے ہو گیا۔ اب علاؤالدین خاں مع قبائل آئیں گے۔ دل خوش ہوا کہ اپنے محبوب کی شکل مع اس کے نتائج کے دیکھوں گا۔ پرسوں آخر روز بھائی پاس گیا۔ اثنائے اختلاط و انبساط میں میں نے پوچھا کہ کہو بھئی علاؤالدین خاں کب آئیں گے؟ جواب کچھ نہیں "اجی وہ قصہ تو طے ہو گیا؟" "ہاں وہ تو روپیہ میں نے دے بھی دیا" میں نے کہا تو اب چاہیے کہ وہ آئیں۔ فرمایا کہ "شاید ابھی نہ آئے"۔

معلوم ہوا کہ خیز تھینگا باجا

ناچار ارادہ کیا کہ جو کچھ کہنا تھا اب میں لکھ کر بھیجوں۔ پرسوں تو شام ہو گئی تھی۔ کل بغلگیر ہونے والوں نے دم نہ لینے دیا۔ اس پر طرہ یہ کہ ثاقب نے کہا کہ بھائی تم سے شاکی ہیں۔

اب ضرور آپڑا کہ گذارش مدعا سے پہلے تمھارے رفع ملال میں کلام کروں۔

بھائی، تم میرے فرزند بلکہ بہ از فرزند ہو۔ اگر میرا صلبی بیٹا اس ویدو وانست وتحریر وتقریر کا ہوتا تو میں اس کو اپنا یار وفادار اور ذریعہ افتخار جانتا۔ میرے خطوط کے نہ پہنچنے کا گلہ غلط۔ تمھارا کونسا خط آیا کہ اس کا جواب یہاں سے نہ لکھا گیا؟ میرے پاس جو مقاصد ضروری فراہم تھے، وہ میں نے اس نظر سے نہ لکھے کہ اب تم آتے ہو، زبانی گفت وشنید ہو جائے گی۔ ثاقب نے چلتی گاڑی میں روڑا اٹکا دیا۔ تب مجھے توطیہ وتمہید میں ایک ورق لکھنا پڑا، ورنہ آغاز نگارش یہاں سے نہ ہوتا۔

یا اسد اللہ الغالب!

با من از جہل معارض شدہ نا منفعلے
کہ گرش ہجو کنم ایں بودش مدح عظیم

یہ رسالہ موسوم بہ ''محرق قاطع برہان'' جو ثاقب نے تم کو بھیجا ہے، میرے کہنے سے بھیجا ہے اور اس ارسال سے میرا مدعا یہ ہے کہ اس کے معائنے کے وقت اس کتاب کی بے ربطی عبارت پر اور میری اپنی قرابت اور نسبت ہائے عدیدہ پر نظر نہ کرو، بیگانہ وار دیکھو اور از روئے انصاف حکم بنو۔ بے حیف ومیل۔

اُس نے جو مجھے گالیاں دی ہیں، اس پر غصہ نہ کرو۔ غلطیاں عبارت کی۔ شدت اطناب ممل اکی صورت سوال دیگر جواب دیگر۔ ان باتوں کو مطمح نظر کرو۔ بلکہ اگر فرصت مساعدت کرے تو ان مراتب کو الگ ایک کاغذ پر لکھو اور بعد اتمام میرے پاس بھیج دو۔ میرا ایک دوست روحانی کہ وہ منجملہ رجال الغیب ہے۔ ان ہفوات کا خاکہ اُڑا رہا ہے۔ تیر رخشاں نے اس کو مدد دی ہے۔ تم بھی بھائی، مدد دو۔

اور وہ امر مبہم کہ جو تمھارے والد کی تقریر سے دل نشیں نہیں ہوا، یعنی قصہ چک جانا اور دلی آنا، اس کا ماجرا مفصل ومشرح لکھو۔

دن، تاریخ، اپنا نام آغاز کتابت میں لکھ آیا ہوں۔ اب ارسال جواب کی تاکید کے سوا اور کیا لکھوں، فقط۔

چہارشنبہ ۱۸ مئی ۱۸۶۴ء بقول عوام باسی عید کا دن، صبح کا وقت۔

(۱۴)

اجی مولانا علائی!

نواب صاحب دو مہینے تک کی اجازت دے چکے اور یہ میں خبر تراشی نہیں کرتا' مرزا علی محمد بیگ کی زبانی ہے کہ نواب علاؤالدین خاں سے کہہ چکے کہ قصہ مٹ گیا ہے۔ اب تم شوق سے دلی جاؤ۔ دو ہفتے سے لیکر دو مہینے تک کی تم کو رخصت ہے۔ پھر تم کیوں نہ آئے؟ خدا نے دعا' خداوند نے استدعا قبول کی' تمھاری طرف سے ست قدمی اور دل سردی کی کیا وجہ؟ اگر حاکی کی حکایت جھوٹ ہے تو تم سچ لکھو کہ ماجرا کیا ہے۔

مرزا یوسف علی خاں عزیز تمھارے بلائے ہوئے اور مہدی حسین' بھائی صاحب کے مطلوب' مرزا عبدالقادر بیگ کے قبائل کے ساتھ کل روانہ لوہارو ہوئے۔

شنبہ ۷ ستمبر ۱۸۶۴ء نجات کا طالب' غالب

(۱۵)

میری جان! ناسازی روزگار و بے ربطی اطوار' بطریق داغ بالائے داغ' آرزوئے دیدار۔ وہ دو آتش شرارہ بار اور یہ ایک دریائے ناپیداکنار۔ وقنا ربنا عذاب النار۔

خدا نے بھائی ضیاءالدین خاں کے بڑھاپے پر اور میری بیکسی پر رحم فرمایا۔ میرا شہاب الدین خاں بچ گیا۔ امراض مختلفہ میں گھر گیا تھا۔ بواسیر خونی' زحیر' تپ' صداع' بارے اب من کل الوجوہ صحت حاصل ہے۔ ضعف جاتے جاتے ہی جائے گا۔ آگے کون قوی تھے کہ اب ان کو ضعیف کہا جائے؟ ایک بڈھا کسی گلی میں جاتے جاتے ٹھوکر کھا کر گر پڑا۔ کہنے لگا ''ہائے بڑھاپا'' ادھر ادھر دیکھا' جب جانا کہ کوئی نہیں ہے' کہتا ہوا بڈھا کہ ''جوانی میں کیا پتھر پڑتے تھے''۔ والسلام

جنوری ۱۸۶۵ء غالب مستہام

(۱۶)

جانا عالی شانا!

خط آیا۔ حظ اٹھایا۔ تمھاری آشفتہ حالی میں ہرگز شک نہیں۔ تم کہیں' قبائل کہیں۔ والی شہر ناسازگار' انجام کار ناپائدار' ایک دل اور سو آزار' اللہ تمھارا یاور' علی تمھارا مددگار۔ میں پادر رکاب' بلکہ نعل

ورآتش۔ کب جاؤں اور فلک سیر کو دیکھوں۔ ایک خط میں نے علی حسین خاں کو لکھا۔ وہاں سے اس کا جواب آ گیا۔ روہیلا پھوڑے پھنسی میں مبتلا ہے۔ خدا اُس کو صحت دے۔ شمشاد علی بیگ کہاں الور پہنچا اور اس طرح گیا کہ شہاب الدین خاں سے مل کر بھی نہ گیا۔ خیر!

رموز مصلحت خویش خسرواں دانند

یہاں جشن کے وہ سامان ہو رہے ہیں کہ جمشید اگر دیکھتا تو حیران رہ جاتا۔ شہر سے دو کوس کے فاصلے پر آغا پور نامی ایک بستی ہے۔ آٹھ دس دن سے وہاں خیام بر پا ہیں۔ پرسوں صاحب کمشنر بہادر بریلی مع چند صاحبوں اور میموں کے آئے اور خیموں میں اُترے۔ کچھ کم سو صاحب اور میم جمع ہوئے۔ سب سرکار رام پور کے مہمان۔ کل سہ شنبہ ۵ دسمبر حضور پرنور بڑے تجمل سے آغا پور تشریف لے گئے۔ اور بارہ پر دو بجے گئے شام خلعت پہن کر آئے۔ وزیر علی خاں 'خانساماں' خواصی میں سے روپیہ پھینکتا ہوا آتا تھا۔ دو کوس کے عرصے میں دو ہزار سے کم نہ نثار ہوا ہو گا۔ آج صاحبان عالی شان کی دعوت ہے۔ 'ٹپن' شام کا کھانا یہیں کھائیں گے۔ روشنی آتشبازی کی وہ افراط کہ رات دن کا سامنا کرے گی۔ طوائف کا وہ ہجوم 'احکام کا وہ مجمع کہ اس مجلس کو طوائف الملوک کہا چاہیے۔ کوئی کہتا ہے کہ صاحب کمشنر بہادر' مع صاحبان عالی شان کے 'کل جائیں گے' کوئی کہتا ہے پرسوں۔ رئیس[1] کی تصویر کھینچتا ہوں۔ قد 'رنگ' شکل 'شمائل بعینہٖ ضیاء الدین خاں۔ عمر کا فرق اور کچھ کچھ چہرہ اور لحیہ متفاوت۔ حلیم 'خلیق' باذل' کریم' متواضع 'متشرع' متورع' شعر فہم۔ سیکڑوں شعر یاد۔ نظم کی طرف توجہ نہیں۔ نثر لکھتے ہیں اور خوب لکھتے ہیں۔ جلالائے طباطبائی کی طرز برتتے ہیں۔ شگفتہ جبیں ایسے کہ ان کے دیکھنے سے غم کوسوں بھاگ جائے۔ فصیح بیان ایسے کہ ان کی تقریر سن کر ایک اور نئی روح قالب میں آئے۔ اللّٰھم دام اقبالہ' وزاد اجلالہ' بعد اختتام محافل طالب رخصت ہوں گا۔ بعد حصول رخصت دلی جاؤں گا۔ بھائی صاحب کی خدمت میں بشرط رسائی و تاب گویائی سلام کہنا اور بچوں کی خیر و عافیت جو تم کو معلوم ہوئی ہے' وہ مجھ کو لکھنا۔ ۶ دسمبر ۱۸۶۵ء کی بُدھ کا دن آٹھ بجا چاہتے ہیں۔ کاتب کا نام غالب ہے کہ تم جانتے ہو گے۔

(۶ دسمبر ۱۸۶۵ء)

(۱۷)

مرزا،

روبرو بہ از پہلو آؤ' میرے سامنے بیٹھ جاؤ۔ آج صبح کے سات بجے باقر علی خاں اور حسین علی خاں مع چودہ مرغ' چھ بڑے اور آٹھ چھوٹے کے' دلّی کو روانہ ہوئے۔ دو آدمی میرے اُن کے ساتھ گئے۔ کلو اور لڑکا نیاز علی یعنی ڈیڑھ آدمی میرے پاس ہیں۔ نواب صاحب نے بوقت رخصت ایک ایک دوشالہ مرحمت کیا۔ مرزا نعیم بیگ ابن مرزا کریم بیگ دو ہفتے سے یہاں وارد ہیں اور اپنی بہن کے ہاں ساکن ہیں۔ کہتے ہیں کہ تیرے ساتھ دلّی چلوں گا اور وہاں سے لوہارو جاؤں گا۔ میرے چلنے کا حال یہ ہے کہ انشاء اللہ تعالیٰ اسی ہفتہ چلوں گا۔

آپ چال چوکے۔ اردو لکھتے لکھتے جو خط مشتمل ایک مطلب پر تھا اس کو تم نے فارسی میں لکھا اور فارسی بھی متصد یانہ کہ امیر کو اور اپنے بزرگ کو کبھی بصیغہ مفرد نہ لکھیں۔ یہ وہی چھوٹی "ہے" بڑی "ہے" کا قصہ ہے۔ خیر خط نہ دکھاؤں گا۔ ما کتب فیہ کہہ کر کام نکال لوں گا۔ مَیں نے تو چلتے وقت فرخ سیر کے اتالیق کی زبانی بھائی کو کہلا بھیجا تھا کہ تم اگر کوئی اپنا مدعا کہو تو مَیں اس کی درستی کرتا لاؤں۔ جواب آیا کہ اور کچھ مدعا نہیں۔ صرف مکانوں کا مقدمہ ہے۔ سو اس مقدمہ میں میرا اور میرے شرکاء کا وکیل وہاں موجود ہے۔ اگر وہ اس امر کا ذکر کرتے تو مَیں ان سے ان کے خالو علی اصغر خاں کے نام عرضی یا خط لکھوا لاتا۔ بہر حال اب بھی قاصر نہ رہوں گا۔ تاریخ اوپر لکھ آیا۔ نام اپنا بدل کر مغلوب رکھ لیا ہے۔

(جمعہ ۲۲ دسمبر ۱۸۶۵ع دو بجے تین کا عمل)

میرزا شہاب الدین احمد خاں ثاقب

(۱۸)

مرزا میاں شہاب الدین خاں اچھی طرح رہو۔ غازی آباد کا حال شمشاد علی سے سنا ہو گا۔ ہفتے کے دن دو تین گھڑی دن چڑھے احباب کو رخصت کر کے راہی ہوا۔ قصد یہ تھا کہ پلکھوے رہوں۔ وہاں قافلے کی گنجائش نہ پائی۔ ہاپوڑ کو روانہ ہوا۔ دونوں برخوردار گھوڑوں پر سوار پہلے چل دیے۔ چار گھڑی دن رہے میں ہاپوڑ کی سرائے میں پہنچا۔ دونوں بھائیوں کو بیٹھے ہوئے اور گھوڑوں کو ٹہلتے ہوئے پایا۔ گھڑی بھر دن رہے قافلہ آیا۔ میں نے چھٹانک بھر گھی داغ کیا۔ دو شامی کباب اس میں ڈال دیے۔ رات ہو گئی تھی، شراب پی، کباب کھائے۔ لڑکوں نے ارہر کی کھچڑی پکوائی۔ خوب گھی ڈال کر آپ بھی کھائی اور سب آدمیوں کو بھی کھلائی۔ دن کے واسطے سادہ سالن پکوایا۔ ترکاری نہ ڈلوائی۔ بارے آج تک دونوں بھائیوں میں موافقت ہے۔ آپس میں صلح و مشورت سے کام کرتے ہیں۔ اتنی بات زائد ہے کہ حسین علی منزل پر اُتر کر پاپڑ اور مٹھائی کے کھلونے خرید لاتا ہے۔ دونوں بھائی مل کر کھا لیتے ہیں۔ آج میں نے تمھارے والد کی نصیحت پر عمل کیا۔ چار پانچ بجے کے عمل میں ہاپوڑ سے چل دیا۔ سورج نکلے بابوگڑھ کی سرائے میں آ پہنچا۔ چارپائی بچھائی، اس پر بچھونا بچھا کر حقہ پی رہا ہوں اور یہ خط لکھ رہا ہوں۔ دونوں گھوڑے کو تل آ گئے۔ دونوں لڑکے رتھ میں سوار آتے ہیں۔ اب وہ آئے اور کھانا کھا لیا اور چلے۔ تم اپنی اُستانی کے پاس جا کر یہ رقعہ سراسر پڑھ کر سنا دینا۔ شمشاد کو کتاب[1] کے مقابلے اور تصحیح کی تاکید کر دینا۔

(غالب)

میرزا قربان علی بیگ خاں سالک

(۱۹)

میری جان، کن اوہام میں گرفتار ہے؟ جہاں باپ کو پیٹ چکا، اب چچا کو بھی رو۔ خدا تجھ کو جیتا رکھے اور تیرے خیالات واحتمالات کو صورت وقوعی دے۔ یہاں خدا سے بھی توقع باقی نہیں، مخلوق کا کیا ذکر؟ کچھ بن نہیں آتی۔ اپنا آپ تماشائی بن گیا ہوں۔ رنج وذلت سے خوش ہوتا ہوں۔ یعنی مَیں نے اپنے کو اپنا غیر تصور کیا ہے۔ جو دکھ مجھے پہنچتا ہے۔ کہتا ہوں: لو، غالب کے ایک اَور جوتی لگی۔ بہت اِتراتا تھا کہ مَیں بڑا شاعر اور فارسی دان ہوں۔ آج دور دور تک میرا جواب نہیں۔ لے اب قرضداروں کو جواب دے۔ سچ تو یوں ہے، غالب کیا مرا، بڑا الحد مرا، بڑا کافر مرا۔ ہم نے ازراہ تعظیم، جیسا بادشاہوں کو بعد ان کے ''جنت آرام گاہ'' و ''عرش نشین'' خطاب دیتے ہیں، چونکہ یہ اپنے کو شاہ قلمرو سخن جانتا تھا، ''سقر مقر'' اور ''ہاویہ زاویہ'' خطاب تجویز کر رکھا ہے۔ ''آئیے نجم الدولہ بہادر!'' ایک قرضدار کا گریباں میں ہاتھ، ایک قرضدار بھوگ سنا رہا ہے۔ مَیں ان سے پوچھ رہا ہوں: ''اجی حضرت نواب صاحب! نواب صاحب کیسے، اوغلان صاحب! آپ سلجوقی اور افراسیابی ہیں۔ یہ کیا بے حرمتی ہو رہی ہے؟ کچھ تو اکسو، کچھ تو بولو، بولے کیا بے حیا، بے غیرت، کوٹھی سے شراب، گندھی سے گلاب، بزاز سے کپڑا، میوہ فروش سے آم، صراف سے دام قرض لئے جاتا تھا۔ یہ بھی سوچا ہوتا، کہاں سے دوں گا۔

(۲۰)

دلدار حمٰن الطاف خفیہ۔ خیر و عافیت تمھاری معلوم ہوئی۔ دم غنیمت ہے۔ جان ہے تو جہان ہے۔ کہتے ہیں کہ خدا سے ناامیدی کفر ہے۔ مَیں تو اپنے باب میں خدا سے ناامید ہو کر کافر مطلق ہو گیا ہوں۔ موافق عقیدہ اہل اسلام جب کافر ہو گیا تو مغفرت کی بھی توقع نہ رہی۔ چل بھئی نہ دنیا، نہ دین۔ مگر تم حتی الوسع مسلمان بنے رہو اور خدا سے ناامید نہ ہو۔ اِنَّ مع العسر یسرا کو اپنا نصب العین رکھو:

در طریقت ہرچہ پیش سالک آید خیر اوست

گھر میں تمھارے سب طرح خیر و عافیت ہے۔ محمد میرزا پنجشنبہ اور جمعہ کو داستان کے

وقت آجاتا ہے۔ رضوان ہر شب کو روز آتا ہے۔ یوسف علی خاں عزیز سلام اور باقر اور حسین علی بندگی کہتے ہیں۔ کلو داروغہ کورنش عرض کرتا ہے۔ اوروں کو یہ پایا حاصل نہیں کہ وہ کورنش بھی بجا لائیں۔ خط بھیجتے رہا کرو۔ والدعا

صبح دوشنبہ ۶ صفر سال حال (۱۲۸۱ھ) اپنی مرگ کا طالب 'غالب'

۱۱ جولائی ۱۸۶۴ء

منشی ہرگوپال تفتہ

(۲۱)

کیوں مہاراج 'کول میں آنا اور منشی نبی بخش صاحب کے ساتھ غزل خوانی کرنی اور ہم کو یاد نہ لانا! مجھ سے پوچھو کہ میں نے کیونکر جانا کہ تم مجھ کو بھول گئے؟ کول میں آئے اور مجھ کو اپنے آنے کی اطلاع نہ دی۔ نہ لکھا میں کیونکر آیا ہوں اور کب تک رہوں گا اور کب جاؤں گا اور بابو صاحب[1] سے کہاں جا ملوں گا۔ خیر' اب جو میں نے بے حیائی کر کے تم کو خط لکھا لازم ہے کہ میرا قصور معاف کرو اور مجھ کو ساری اپنی حقیقت لکھو۔ تمھارے ہاتھ کی لکھی ہوئی غزلیں بابو صاحب کی میرے پاس موجود ہیں اور اصلاح پا چکی ہیں۔ اب میں حیران ہوں کہ کہاں بھیجوں۔ ہر چند انھوں نے لکھا ہے کہ 'اکبرآباد ہاشم علی خاں کو بھیج دو' لیکن میں نہ بھیجوں گا۔ جب وہ اجمیر یا بھرت پور پہنچ کر مجھ کو خط لکھیں گے' تو میں ان کو وہ اوراق ارسال کر دوں گا یا تم جو لکھو گے' اس پر عمل کروں گا' بھائی ایک دن شراب نہ پیو یا کم پیو اور ہم کو دو چار سطریں لکھ بھیجو کہ ہمارا دھیان تم میں لگا ہوا ہے۔

رقم زدہ یک شنبہ ۴ جنوری ۱۸۵۲ء اسد اللہ

(۲۲)

کاشانۂ دل کے ماہ دو ہفتہ منشی ہرگوپال تفتہ۔ تحریر میں کیا کیا سحر طرازیاں کرتے ہیں۔ اب ضرور آ پڑا ہے کہ ہم بھی جواب اسی انداز سے لکھیں۔ سنو صاحب' یہ تم جانتے ہو کہ زین

العابدین خاں مرحوم میرا فرزند تھا اور اب اس کے دونوں بچے کہ وہ میرے پوتے ہیں' میرے پاس آ رہے ہیں اور دم بدم مجھ کو ستاتے ہیں اور میں تحمل کرتا ہوں۔ خدا گواہ ہے کہ میں تم کو اپنے فرزند کی جگہ سمجھتا ہوں۔ پس تمہارے نتائج طبع میرے معنوی پوتے ہوئے۔ جب ان عالم کے پوتوں سے کہ مجھے کھانا نہیں کھانے دیتے' ننگے ننگے پاؤں میرے پلنگ پر رکھتے ہیں۔ کہیں پانی لڑھاتے ہیں' کہیں خاک اُڑاتے ہیں' میں نہیں تنگ آتا تو ان معنوی پوتوں سے کہ ان میں یہ باتیں نہیں' میں کیوں گھبراؤں گا؟ آپ ان کو جلد بہ سبیل ڈاک میرے پاس بھیج دیجیے کہ میں ان کو دیکھوں۔ وعدہ کرتا ہوں کہ پھر جلد ان کو تمہارے پاس بہ سبیل ڈاک بھیج دوں گا۔ حق تعالیٰ تمہارے عالم صورت کے بچوں کو جیتا رکھے اور ان کو دولت و اقبال دے اور تم کو ان کے سر پر سلامت رکھے اور تمہارے معنوی بچوں یعنی نتائج طبع کو فروغ' شہرت اور حسن قبول عطا فرمائے۔ بابو صاحب کے نام کا خط ان کے خط کے جواب میں پہنچتا ہے' ان کو دے دیجیے گا۔ اور ہاں صاحب بابو صاحب اور تم آ بو کو جانے لگو تو مجھ کو اطلاع کرنا اور تاریخ روانگی لکھ بھیجنا تا کہ میں بے خبر نہ رہوں۔ والدعا

نگاشتہ جمعہ ۱۸ جون ۱۸۵۲ء   اسداللہ

(۲۳)

بھائی!

ہاں میں نے ''زبدۃ الاخبار'' میں دیکھا کہ رانی صاحبہ مر گئیں۔ کل ایک دوست کا خط اکبر آباد سے آیا۔ وہ لکھتا ہے کہ راجہ مرا' رانی مری' ابھی ریاست کا کوئی رنگ قرار نہیں پایا۔ صورت انتظام جانی بیج ناتھ کے آنے پر موقوف ہے۔ یہاں تک اس دوست کی تحریر ہے۔ ظاہراً اس کو بابو صاحب کا نام نہیں معلوم۔ ان کے بھائی کا نام یاد رہ گیا۔ صرف اس دوست نے بطریق اخبار لکھا ہے۔ اس کو میری اور جانی جی کی دوستی کا بھی علم نہیں۔ حاصل اس تحریر سے یہ ہے کہ اگر یہ خبر سچ ہے تو ہمارے دوست کا نام بنا رہے گا۔ آمین یارب العالمین۔

صاحب' جے پور کا مقدمہ اب لائق اس کے نہیں ہے کہ اس کا خیال کریں۔ ایک ہنا ڈالی تھی' وہ نہ اٹھی۔ راجا لڑکا ہے اور چھچھورا ہے۔ راول جی اور سعد اللہ خاں بنے رہتے تو کوئی

بات نکل آتی اور یہ جو اب آپ لکھتے ہیں کہ راجہ تیرے دیوان کو پڑھا کرتا ہے اور پیش نظر رکھتا ہے' یہ بھی تو آپ ازروئے تحریر منشی ہردیو سنگھ کہتے ہیں۔ اُن کا بیان کیوں کر دل نشین ہو؟ وہ بھی جو بابو صاحب لکھ چکے ہیں کہ پانسو روپے نقد اور خلعت مرزا صاحب کے واسطے تجویز ہو چکا ہے' ہولی ہو چکی اور مَیں لے کر چلا۔ پھاگن' چیت' بیساکھ' نہیں معلوم ہولی کس مہینے میں ہوتی ہے' آگے تو پھاگن میں ہوتی تھی۔

بندہ پرور' بابو صاحب نے پہلی بار تو مجھ کو دو ہنڈویاں بھیجی ہیں' سو سو روپے کی۔ ایک تو میر احمد حسین میکش کے واسطے' راجا صاحب کی طرف سے' تاریخ تولد کنور صاحب کے انعام میں اور ایک اپنی طرف سے مجھ کو بطریق نذر شاگردی۔ بعد اس کے دو ہنڈویاں سو سو روپے کی بعد چار چار پانچ پانچ مہینے کے آئیں' مع میر احمد حسین کے صلے کے روپیوں کے۔ چار سو اور اس کے علاوہ تین سو اور یہ کہ چار سو یا تین سو کتنے دن میں آئے۔ اس کا حساب کنور صاحب کی عمر پر حوالے ہے۔ اگر وہ دو برس کے ہیں تو دو برس میں اور اگر تین برس کے ہیں تو تین برس میں۔

ہاں صاحب' یہ وہی میر قاسم علی صاحب ہیں' جو میرے پرانے دوست ہیں۔ پرسوں یا اترسوں جو ڈاک کا ہرکارہ تمھارا خط لایا تھا' وہ ایک خط میر صاحب کے نام کا' کوئی میاں حکمت اللہ ہیں' ان کا میرے مکان کے پتے سے لایا تھا۔ وہ مَیں نے لے کر رکھ لیا ہے۔ جب میر صاحب آ جاویں تو ان کو میرا اسلام کہنا اور کہنا کہ حضرت' اگر میرے واسطے نہیں' تو اس خط کے واسطے آپ دِلّی آیئے۔

غالب

(۲۴)

تمھاری خیر و عافیت معلوم ہوئی۔ غزل نے محنت کم لی۔ بھائی کا ہاترس سے آنا معلوم ہوا۔ آویں تو میرا اسلام کہہ دینا۔

یہ تمھارا دعا گو اگرچہ اور امور میں پایہ عالی نہیں رکھتا' مگر احتیاج میں اس کا پایہ بہت عالی ہے' یعنی بہت محتاج ہوں۔ سو دو سو میں میری پیاس نہیں بجھتی۔ تمھاری ہمت پر سو ہزار آفرین۔ جے پور سے اگر مجھ کو دو ہزار ہاتھ آ جاتے تو میرا قرض رفع ہو جاتا اور پھر اگر دو چار برس

کی زندگی ہوتی، تو اتنا ہی قرض اور ل جاتا۔ یہ پانسو تو بھائی تمھاری جان کی قسم متفرقات میں جا کر سوڈیڑھ سو بچ رہیں گے، سوہ میرے صرف میں آئیں گے۔ مہاجنوں کا سودی جو قرض ہے وہ بقدر پندرہ سولہ سے کے باقی رہے گا اور وہ جو سو بابو صاحب سے منگوائے گئے تھے وہ صرف انگریز سوداگر کے دینے تھے قیمت اس چیز کی جو ہمارے مذہب میں حرام اور تمھارے مشرب میں حلال ہے۔ سووہ دیئے گئے۔ یقین ہے کہ آج کل میں بابو صاحب کا خط مع ہنڈوی آجائے۔ بابو صاحب کے جو خطوط ضروری اور کاغذ ضروری میرے پاس آئے ہوئے تھے۔ وہ میں نے پنجشنبہ ۲۶ مئی کو پارسل میں ان کے پاس روانہ کردیئے اور اس میں بھی لکھ بھیجا کہ ہنڈوی اور میرے بھیجے ہوئے لفافے جلد بھیج دو۔ پنجشنبہ پنجشنبہ پندرہ دن آج پورے ہوئے۔

(غالب)

(۲۵)

بھائی!

جس دن تم کو خط بھیجا، تیسرے دن ہر دیو سنگھ کی عرضی اور پچیس روپے کی رسید اور پانسو کی ہنڈوی پہنچی۔ تم سمجھے؟ بابو صاحب نے پچیس روپے ہر دیو سنگھ کو دیئے اور مجھ سے مجرا نہ لئے۔ بہ ہر حال ہنڈوی بارہ دن کی میعادی تھی۔ چھ دن گزر گئے تھے چھ دن باقی تھے۔ مجھ کو صبر کہاں؟ متی کاٹ کر روپے لے لئے۔ قرض متفرق سب ادا ہوا۔ بہت سبکدوش ہو گیا۔ آج میرے پاس سینتالیس نقد بکس میں اور چار بوتل شراب اور تین شیشے گلاب کے توشہ خانے میں موجود ہیں۔ الحمد للہ علی احسانہٖ۔

بھائی صاحب آ گئے ہوں تو میر قاسم علی خاں کا خط ان کو دے دو اور میرا سلام کہو اور پھر مجھ کو لکھو تاکہ میں ان کو خط لکھوں۔ بھائی صاحب بھرت پور آ جائیں تو آپ کاہلی نہ کیجئے گا اور ان کے پاس جایئے گا کہ وہ تمھارے جویائے دیدار ہیں۔

سہ شنبہ ۲۴ جون ۱۸۵۳ء اسداللہ

(۲۶)

بھائی!

مَیں نے مانا تمھاری شاعری کو مَیں جانتا ہوں کہ کوئی دم تم کو فکرِ سخن سے فرصت نہ ہو گی۔ پر جو تم نے التزام کیا ہے ترصیع کی صنعت کا اور دولخت شعر لکھنے کا' اس میں ضرور نشست معنی بھی ملحوظ رکھا کرو اور جو لکھو اس کو دوبارہ سہ بارہ دیکھا کرو۔

کیوں صاحب، یہ ڈبل خط پوسٹ پیڈ بھیجنا اور وہ بھی دتی سے سکندرآباد کو' آیا حاتم کے سوا اور میرے سوا کسی نے کیا ہوگا؟ کیا ہنسی آتی ہے تمھاری باتوں پر۔ خدا تم کو جیتا رکھے اور جو کچھ تم چاہو تم کو دے۔ جانی جی کی بڑی فکر ہے۔ مَیں تم کو لکھا چاہتا تھا کہ ان کا حال لکھو۔ تمھارے خط سے معلوم ہوا کہ تم کو بھی نہیں معلوم کہ وہ کہاں ہیں۔ یقین ہے کہ اجمیر میں ہوں گے' مگر خط نہیں بھیجا جاتا کہ وہاں مقیم نہیں ہیں۔ خدا جانے کب چل نکلیں۔ بہر حال تم بھرت پور کے قریب ہو اور ان کے متوسلوں کو جانتے ہو اور اگر ہو سکے تو کسی کو لکھ کر خبر منگوا لو اور جو کچھ تم کو معلوم ہو وہ بھی مجھ کو لکھو۔ منشی صاحب' امع منشی عبداللطیف کول میں آ گئے۔ کل ان کا خط مجھ کو آیا تھا۔ آج اس کا جواب بھی روانہ کر دیا۔

یک شنبہ ۲۱ اگست ۱۸۵۳ء   اسد اللہ

(۲۷)

منشی صاحب!

تمھارا خط اس دن' یعنی کل بدھ کے دن پہنچا کہ مَیں چار دن سے لرزے میں مبتلا ہوں اور مزہ یہ ہے کہ جس دن سے لرزہ چڑھا ہے' کھانا مطلق نہیں کھایا۔ آج پنجشنبہ پانچواں دن ہے کہ نہ کھانا دن کو میسر ہے اور نہ رات کو شراب۔ حرارت مزاج میں بہت ہے' ناچار احتراز کرتا ہوں۔ بھائی اس لطف کو دیکھو کہ پانچواں دن ہے کھانا کھائے۔ ہرگز بھوک نہیں لگی اور طبیعت غذا کی طرف متوجہ نہیں ہوئی۔ بابو صاحب والا مناقب کا خط تمھارے نام کا دیکھا۔ اب اس سال میں وہ آسانی نہ رہی اور بندہ دشواری سے بھاگتا ہے۔ کیوں تکلیف کریں؟ اور اگر بہر حال ان کی مرضی ہے تو خیر میں فرمان پذیر ہوں۔ اشعار سابق وحال میرے پاس امانت ہیں' بعد اچھے ہونے

کے ان کو دیکھوں گا اور تم کو بھیج دوں گا۔ اتنی سطریں مجھ سے بہ ہزار جرثقیل لکھی گئی ہیں۔

روز پنجشنبہ ۲ مارچ ۱۸۵۴ء اسد اللہ

(۴۸)

صاحب!

دیباچہ و تقریظ کا لکھنا ایسا آسان نہیں ہے کہ جیسا تم کو دیوان کا لکھ لینا۔ کیوں روپیہ خراب کرتے ہو اور کیوں چھپواتے ہو؟ اگر یوں ہی جی چاہتا ہے تو ابھی کہے جاؤ۔ آگے چل کر دیکھ لینا۔ اب یہ دیوان چھپوا کر اور تیسرے دیوان کی فکر میں پڑو گے۔ تم دو چار برس میں ایک دیوان کہہ لو گے' مَیں کہاں تک دیباچہ لکھا کروں گا؟ مدعا یہ ہے کہ اس دیوان کو اس دیوان کے برابر ہو لینے دو۔ اب کچھ قصیدہ و رباعی کی فکر کیا کرو۔ دو چار برس میں اس قسم سے جو کچھ فراہم ہو جائے دوسرے دیوان میں اس کو بھی درج کرو۔ صاحب' جہاں تقطیع میں الف نہ سمائے' وہاں کیوں لکھو؟

(۱۸۵۵ء) اسد

(۴۹)

صاحب!

تم جانتے ہو کہ یہ معاملہ کیا ہے اور کیا واقع ہوا؟ وہ ایک جنم تھا کہ جس میں ہم تم باہم دوست تھے اور طرح طرح کے ہم میں تم میں معاملات مہر و محبت در پیش آئے۔ شعر کہے' دیوان جمع کیے۔ اسی زمانے میں ایک بزرگ تھے کہ وہ ہمارے تمہارے دوست دلی تھے اور منشی نبی بخش ان کا نام اور حقیر تخلص تھا۔ ناگاہ نہ وہ زمانہ رہا' نہ وہ معاملات' نہ وہ اختلاط' نہ وہ انبساط۔ بعد چند مدت کے پھر دوسرا جنم ہم کو ملا۔ اگر چہ صورت اس جنم کی بعینہ مثل پہلے جنم کے ہے۔ یعنی ایک خط مَیں نے منشی نبی بخش صاحب کو بھیجا' اس کا جواب مجھ کو آیا اور ایک خط تمہارا کہ تم بھی موسوم بہ منشی ہر گوپال اور متخلص بہ تفتہ ہو' آج آیا اور مَیں جس شہر میں ہوں اس کا نام بھی دلی اور اس محلے کا نام بلی ماروں کا محلّہ ہے' لیکن ایک دوست اُس جنم کے دوستوں میں سے نہیں پایا جاتا۔ واللہ ڈھونڈنے کو مسلمان اس شہر میں نہیں ملتا۔ کیا امیر' کیا غریب' کیا اہل حرفہ' اگر کچھ ہیں تو باہر کے ہیں۔ ہنود البتہ کچھ کچھ آباد ہو گئے ہیں۔

اب پوچھو تو کیوں کر مسکن قدیم میں بیٹھا رہا؟ صاحب بندہ مَیں حکیم محمد حسن خاں مرحوم کے مکان میں نو دس برس سے کرایہ کو رہتا ہوں اور یہاں قریب کیا دیوار بہ دیوار ہیں گھر حکیموں کے اور وہ نوکر ہیں راجا نرندر سنگھ بہادر والی پٹیالہ کے۔ راجا صاحب نے صاحبان عالی شان سے عہد لیا تھا کہ بروقت غارت دہلی یہ لوگ بچے رہیں۔ چنانچہ بعد فتح راجا کے سپاہی یہاں آ بیٹھے اور یہ کوچہ محفوظ رہا۔ ورنہ مَیں کہاں اور یہ شہر کہاں؟ مبالغہ نہ جاننا' امیر' غریب سب نکل گئے۔ جو رہ گئے تھے نکالے گئے۔ جاگیردار' پنسن دار' دولت مند' اہل حرفہ' کوئی بھی نہیں ہے۔ مفصل حالات لکھتے ہوئے ڈرتا ہوں۔ ملازمان قلعہ پر شدت ہے۔ بازپرس اور دار و گیر میں مبتلا ہیں' مگر وہ نوکر جو اس ہنگام میں نوکر ہوئے ہیں اور ہنگامے میں شریک رہے ہیں۔ مَیں غریب شاعر' دس برس سے تاریخ لکھنے اور شعر کی اصلاح دینے پر متعلق ہوا ہوں۔ خواہ اس کو نوکری سمجھو، خواہی مزدوری جانو۔ اس فتنہ و آشوب میں کسی مصلحت میں مَیں نے دخل نہیں دیا۔ صرف اشعار کی خدمت بجالاتا رہا اور نظر اپنی بے گناہی پر' شہر سے نکل نہیں گیا۔ میرا شہر میں ہونا حکام کو معلوم ہے۔ مگر چونکہ میری طرف بادشاہی دفتر میں سے یا مخبروں کے بیان سے کوئی بات نہیں پائی گئی' لہٰذا طلبی نہیں ہوئی۔ ورنہ جہاں بڑے بڑے جاگیردار بلائے ہوئے یا پکڑے ہوئے آئے ہیں' میری کیا حقیقت تھی۔ غرض اپنے مکان میں بیٹھا ہوں۔ دروازہ سے باہر نہیں نکل سکتا۔ سوار ہونا اور کہیں جانا تو بہت بڑی بات ہے۔ رہا یہ کہ کوئی میرے پاس آوے' شہر میں ہے کون؟ گھر کے گھر بے چراغ پڑے ہیں۔ مجرم سیاست پاتے جاتے ہیں۔ جرنیلی بندوبست یازدہم مئی سے آج تک یعنی شنبہ پنجم دسمبر ۱۸۵۷ع تک بدستور ہے۔ کچھ نیک و بد کا حال معلوم نہیں' بلکہ ہنوز ایسے امور کی طرف حکام کو توجہ بھی نہیں۔ دیکھیے' انجام کار کیا ہوتا ہے۔ یہاں سے باہر اندر کوئی بغیر ٹکٹ کے آنے جانے نہیں پاتا۔ تم زنہار یہاں کا ارادہ نہ کرنا۔ ابھی دیکھنا چاہیے مسلمانوں کی آبادی کا حکم ہوتا ہے یا نہیں۔ بہر حال منشی صاحب کو میرا سلام کہنا اور یہ خط دکھا دینا۔ اس وقت تمھارا خط پہنچا اور اسی وقت مَیں نے یہ خط لکھ کر ڈاک کے ہرکارے کو دے دیا۔

شنبہ ۵ دسمبر ۱۸۵۷ع (غالب)

(۳۰)

آج سنیچر (ہفتہ) کو دو پہر کے وقت ڈاک کا ہرکارہ آیا اور تمہارا خط لایا۔ میں نے پڑھا اور جواب لکھا اور کلیان کو دیا۔ وہ ڈاک کو لے گیا۔ خدا چاہے تو کل پہنچ جائے۔ میں تم کو لکھ چکا ہوں کہ دلی کا قصد کیوں کرو اور یہاں آ کر کیا کرو گے؟ بنک گھر میں سے خدا کرے تمہارا روپیہ مل جائے۔

بھائی، میرا حال یہ ہے کہ دفتر شاہی میں میرا نام مندرج نہیں نکلا۔ کسی مخبر نے بہ نسبت میرے کوئی خبر بدخواہی کی نہیں دی۔ حکام وقت میرا شہر میں ہونا جانتے ہیں۔ فراری نہیں ہوں، روپوش نہیں ہوں، بلایا نہیں گیا۔ دارو گیر سے محفوظ ہوں۔ کسی طرح کی باز پُرس ہو تو بلایا جاؤں۔ مگر ہاں جیسا کہ بلایا نہیں گیا، خود بھی بروئے کار نہیں لایا۔ کسی حاکم کو نہیں ملا۔ خط کسی کو نہیں لکھا۔ کسی کو درخواست نہیں کی۔ مئی سے پنسن نہیں پایا۔ کہو، یہ دس مہینے کیوں کر گزرے ہوں گے۔ انجام کچھ نظر نہیں آتا کہ کیا ہوگا۔ زندہ ہوں، مگر زندگی وبال ہے۔ ہرگوبند سنگھ یہاں آئے ہوئے ہیں۔ ایک بار میرے پاس بھی آئے تھے۔ والدعا

روز شنبہ ۱۴م جنوری ۱۸۵۸ء وقت نیمروز غالب

(۳۱)

صاحب! کیوں مجھے یاد کیا؟ کیوں خط لکھنے کی تکلیف اٹھائی؟ پھر یہ کہتا ہوں کہ خدا تم کو جیتا رکھے کہ تمہارے خط میں مولوی قمرالدین کا سلام بھی آیا اور بھائی منشی نبی بخش کی خیر و عافیت بھی معلوم ہوئی۔ وہ تو پنسن کے فکر میں تھے۔ ظاہر آ یوں مناسب دیکھا ہوگا کہ نوکری کی خواہش کی۔ حق تعالیٰ ان کی جو مراد ہو بر لائے۔ ان کو میرا سلام کہہ دینا۔ بلکہ یہ رقعہ پڑھوا دینا۔ مولوی قمرالدین خاں کو بھی میرا سلام کہنا۔

تم اپنے کلام کے بھیجنے میں مجھ سے پُرسش کیوں کرتے ہو؟ چار جزو ہیں تو، بیس جزو ہیں تو، بے تکلف بھیج دو۔ میں شاعر سخن سنج اب نہیں رہا، صرف سخن فہم رہ گیا ہوں۔ بوڑھے پہلوان کی طرح پیچ بتانے کی گوں کا ہوں۔ بناوٹ نہ سمجھنا شعر کہنا مجھ سے بالکل چھوٹ گیا۔ اپنا اگلا کلام

دیکھ کر حیران رہ جاتا ہوں کہ میں نے کیوں کر کہا تھا۔ قصہ مختصر وہ اجزا جلد بھیج دو۔
یک شنبہ ۱۱ اپریل ۱۸۵۸ء   غالب

(۳۲)

کیوں صاحب! اس کا کیا سبب ہے کہ بہت دن سے ہماری آپ کی ملاقات نہیں ہوئی، نہ مرزا صاحب ہی آئے نہ منشی صاحب ہی تشریف لائے۔ ہاں ایک بار منشی شیو نرائن صاحب نے کرم کیا تھا اور خط میں رقم کیا تھا کہ اب ایک فرمہ باقی رہا ہے۔[1] اس راہ سے میں یہ تصور کر رہا ہوں کہ اگر ایک فرمہ نثر باقی تھا تو اب قصیدہ چھاپا جاتا ہوگا اور اگر فرمہ قصیدہ کا تھا تو اب جلدیں بننی شروع ہوگئی ہوں گی۔

تم سمجھے؟ میں تمھارے اور منشی نبی بخش صاحب اور جناب مرزا حاتم علی صاحب کے خطوط کے آنے کو تمھارا اور ان کا آنا سمجھتا ہوں۔ تحریر گویا وہ مکالمہ ہے جو باہم ہوا کرتا ہے۔ پھر تم کہو مکالمہ کیوں موقوف ہے؟ اور کیا دیر ہے؟ اور وہاں کیا ہو رہا ہے؟ بھائی صاحب کو کاپی کی تصحیح سے فراغت ہوگئی؟ مرزا صاحب نے جلدیں صحاف کو دے دیں؟ اب میں ان کتابوں کا آنا کب تک تصور کروں؟ دسہرے میں ایک دو دن کی تعطیل مقرر ہوئی ہوگی۔ کہیں دیوالی کی تاریخ تک نوبت نہ پہنچ جائے۔

ہاں صاحب، تم نے کبھی کچھ حال قمر الدین خان صاحب کا ذکر نہ لکھا۔ آگے اس سے تم نے اگست، ستمبر میں ان کا آگرے کا آنا لکھا۔ پھر وہ اکتوبر تک کیوں نہ آئے؟ وہاں تو منشی غلام غوث صاحب اپنا کام بدستور کرتے ہیں، پھر یہ اس دفتر میں کیا کر رہے ہیں؟ کہیں کسی اور کام پر معین ہوگئے ہیں؟ اس کا حال جلد لکھو۔ مجھ کو یاد پڑتا ہے کہ تم نے لکھا تھا کہ منشی غلام غوث خاں صاحب کو ایک گاؤں جاگیر میں ملا ہے۔ مولوی قمر الدین خان صاحب اس کے بندوبست کو آیا چاہتے ہیں، اس کا ظہور کیوں نہ ہوا؟ ان سب باتوں کا جواب جلد لکھیے۔ جناب مرزا صاحب کو میرا سلام کہیے اور یہ پیغام کہیے کہ کتاب کا حسن کانوں سے سنا، دل کو دیکھنے سے زیادہ یقین آیا، مگر آنکھوں کو رشک ہے کانوں پر اور کان چشمک زنی کر رہے ہیں آنکھوں پر۔ یہ ارشاد ہو کہ آنکھوں کا حق آنکھوں کو کب تک ملے گا؟ بھائی صاحب کو بعد از سلام کہیے گا کہ حضرت اپنے مطلب کی تو

مجھ کو جلدی نہیں ہے۔ آپ کی تخفیف تصدیع چاہتا ہوں یعنی اگر کاپی کا قصہ تمام ہو جائے تو آپ کو آرام ہو جائے۔ منشی شیونرائن صاحب کی عنائتوں کا شکر میری زبانی ادا کیجئے گا اور یہ کہیے گا کہ آپ کا خط پہنچا۔ چونکہ میرے خط کا جواب تھا اور معہذا کوئی امر جواب طلب نہ تھا۔ اس واسطے اس کا جواب نہیں لکھا۔ زیادہ زیادہ۔

نگاشتہ و رواں داشتہ پنج شنبہ ۔ ۱۶۔ اکتوبر ۱۸۵۸ء غالب

(۳۳)

کیوں صاحب! کیا یہ آئین جاری ہوا ہے کہ سکندر آباد کے رہنے والے دلی کے خاک نشینوں کو خط نہ لکھیں؟ بھلا اگر یہ حکم ہوا ہوتا تو یہاں بھی تو اشتہار ہو جاتا کہ زنہار کوئی خط سکندر آباد کو یہاں کی ڈاک میں نہ جائے۔ بہر حال:

کس بشنود یا نشنود من گفتگوئے ی کنم

کل جمعہ کے دن' ۱۲ تاریخ نومبر کی تینتیس جلدیں' بھیجی ہوئی برخوردار شیونرائن کی پہنچیں۔ کاغذ' خط' تقطیع' سیاہی' چھاپا سب خوب' دل خوش ہوا اور شیونرائن کو دعا دی۔ سات کتابیں جومرزا حاتم علی صاحب کی تحویل میں ہیں' وہ بھی یقین ہے کہ آج کل پہنچ جائیں۔ معلوم نہیں' منشی شیونرائن نے اندور کو واسطے امید سنگھ کے کس طرح بھیجی ہیں یا ابھی نہیں بھیجیں۔

صاحب' تم اس خط کا جواب جلد لکھو اور اپنے قصد کا حال لکھو۔ سکندر آباد کب تک رہو گے؟ آگرہ کب جاؤ گے؟

شنبہ ۱۳۔ نومبر ۱۸۵۸ء جواب طلب' غالب

(۳۴)

مرزا تفتہ' تمہارا خط آیا۔ فقیر کو حقیر کا حال معلوم ہوا۔ خدا فضل کرے۔ اگر تم اس راز کے اظہار کو منع نہ کرتے تو بھی میرا شیوہ ایسا لغو نہیں ہے کہ میں ان کو لکھتا۔ لکھتے ہیں کہ میرزا مہر کے دو چار روپے زائد صرف ہو گئے تو کیا اندیشہ ہے۔ حال یہ ہے کہ میں نے ان سے استفسار کیا تھا۔

انھوں نے مجھ کو لکھا کہ کتابوں کی درستی میں بارہ روپے صرف ہوئے ہیں۔محصول کی ایک رقم خفیف اگر میں نے اپنے پاس سے دی تو اس کا مضایقہ۔ مجھ کو تمھارا قول مطابق واقع نظر آتا ہے۔ البتہ ان کے دو تین روپے اٹھ گئے ہوں گے۔

لالہ گنگا پرشاد تخلص اپنے کو تمھارا شاگرد بتاتے ہیں، مگر ریختہ کہتے ہیں۔ کئی دن ہوئے یہاں آئے اور بالمکند بے صبر کی غزلیں اصلاح کو لائے۔ وہ دیکھ کر ان کے حوالے کر دیں۔

ہنری اسٹوارٹ ریڈ صاحب ممالک مغربی کے مدرسوں کے ناظم اور گورنمنٹ کے بڑے مصاحب ہیں۔امن کے دنوں میں ایک ملاقات میری ان کی ہوئی تھی۔میں نے اب ایک کتاب سادہ بے جلد ان کو بھیجی تھی۔کل ان کا خط مجھ کو اس کتاب کی رسید میں آیا۔ بہت تعریف لکھتے تھے اور ہاں بھئی ایک تماشا اور ہے، مجھ کو لکھتے تھے کہ یہ 'دستنبو' پہلے اس سے کہ تم بھیجو، مطبع مفید خلائق نے ہمارے پاس بھیجی ہے اور ہم اس کو دیکھ رہے اور خوش ہو رہے تھے کہ تمھارا خط مع کتاب کے پہنچا۔ان کے اس لکھنے سے یہ معلوم ہوا کہ مطبع میں سے گورنر کی نذر بھی ضرور گئی ہوگی۔ کیا اچھی بات ہے کہ وہاں بھی میرے بھیجنے سے پہلے میرا کلام پہنچ جائے گا۔چیف کمشنر پنجاب کو یہ کتاب بھیج چکا ہوں اور نواب گورنر کی نذر اور ملکہ کی نذر اور سیکرٹریوں کی نذر یہ پارسل انشاء اللہ تعالیٰ آج روانہ ہو جائیں گے۔دیکھوں، چیف کمشنر کیا لکھتے ہیں اور گورنر کیا فرماتے ہیں:

تا نہال دوستی کے بر دہد   حالیا رفتیم و تخمے کاشتیم

شنبہ ۲۸۔نومبر ۱۸۵۸ء   غالب

(۳۵)

صاحب،

تمھارا خط آیا۔میں نے اپنے سب مطالب کا جواب پایا۔امراؤ سنگھ کے حال پر اس کے واسطے مجھ کو رحم اور اپنے واسطے رشک آتا ہے۔اللہ اللہ! ایک وہ ہیں کہ دو بار ان کی بیڑیاں کٹ چکی ہیں، ایک ہم ہیں کہ ایک اوپر پچاس برس سے جو پھانسی کا پھندا گلے میں پڑا ہے، نہ تو پھندا ہی

ٹوٹتا ہے، نہ دم ہی نکلتا ہے۔ اس کو سمجھاؤ کہ میں تیرے بچوں کو پال لوں گا، تو کیوں بلا میں پھنستا ہے؟

وہ جو مصرع تم نے لکھا ہے وہ حکیم سنائی کا ہے اور وہ نقل 'حدیقہ' میں مرقوم ہے:

پسرے با پدر بزاری گفت — کہ مرا یار شو بہ ہمرہ جفت
گفت بابا، زنا کن و زن نے — پند از خلق گیر و از من نے
در زنا، گر بگیردت عسسے — بہلد، کو گرفت چوں تو بسے
زن کنی، ہر گزت رہا نہ کند — ور تو بگزاریش چہا نہ کند

بس تو اب تم سکندرآباد میں رہو، کہیں اور کیوں جاؤ گے؟ بنک گھر کا روپیہ اٹھا چکے ہو، اب کہاں سے کھاؤ گے؟ میاں نہ میرے سمجھانے کو دخل ہے، نہ تمہارے سمجھنے کی جگہ ہے۔ ایک چرخ ہے کہ وہ چلا جاتا ہے۔ جو ہونا ہے وہ ہوا جاتا ہے۔ اختیار ہو تو کچھ کیا جائے، کہنے کی بات ہو تو کچھ کہا جائے۔ مرزا عبدالقادر بیدل نے خوب کہا ہے:

رغبت جاہ چہ و نفرت اسباب کدام
زیں ہوسہا بگرر یا مگرر، مے گزرد

مجھ کو دیکھو کہ نہ آزاد ہوں نہ مقید، نہ رنجور نہ تندرست، نہ خوش نہ ناخوش، نہ مردہ نہ زندہ۔ جئے جاتا ہوں۔ باتیں کئے جاتا ہوں، روٹی روز کھاتا ہوں، شراب گاہ گاہ پئے جاتا ہوں۔ جب موت آئے گی مر رہوں گا۔ نہ شکر ہے، نہ شکایت ہے۔ جو تقریر ہے، بہ سبیل حکایت ہے۔ بارے جہاں رہو، جس طرح رہو، ہر ہفتے میں ایک بار خط لکھا کرو۔

یک شنبہ ۱۹۔ دسمبر ۱۸۵۸ء — غالب

(۳۶)

دیکھو صاحب!

یہ باتیں ہم کو پسند نہیں۔ ۱۸۵۸ء کے خط کا جواب ۱۸۵۹ء میں بھیجتے ہو اور مزا یہ ہے کہ جب تم سے کہا جائے گا تو یہ کہو گے کہ میں نے دوسرے ہی دن جواب لکھا ہے۔ لطف اس میں

ہے کہ میں بھی سچا اور تم بھی سچے۔

آج تک رائے امید سنگھ یہیں ہیں اور ابھی نہیں جائیں گے۔ تمھارا مدعا حاصل ہو گیا ہے۔ جس دن وہ آئے تھے اسی دن مجھ سے کہہ گئے تھے۔ مَیں بھول گیا اور اس خط میں تم کو نہ لکھا۔ صاحب وہ فرماتے تھے کہ مَیں نے کئی مجلد مرزا تفتہ کے دیوان کے اور کئی نسخے ''تضمین اشعار گلستان'' کے ان کی خواہش کے بموجب، کوئی پارسی ہے بمبئی میں اُس کے پاس بھیج دیے ہیں۔ یقین ہے کہ وہ ایران کو ارسال کرے گا۔ امید سنگھ نے اس پارسی کا نام بھی لیا تھا۔ مَیں بھول گیا۔ اب جو تم کو اس خیال میں مبتلا پایا تو ان کا بیان مجھ کو یاد آیا۔ جانتا ہوں کہ وہ کہاں رہتے ہیں۔ دو بار ان کے گھر بھی گیا ہوں۔ مگر محلے کا نام نہیں جانتا۔ نہ میرے آدمیوں میں کوئی جانتا ہے۔ اب کسی جاننے والے سے پوچھ کر تم کو لکھ بھیجوں گا۔

میر بادشاہ سے عندالملاقات میری دعا کہہ دینا۔

لَاحَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰہِ۔ لکھنے کے قابل بات پھر بھول گیا۔ کل میر کرامت علی صفا تخلص کہ مَیں نے آگے ان کو کبھی نہیں دیکھا تھا۔ ناگاہ مجھ سے آکر ملے اور تمھارا پوچھتے رہے۔ مَیں نے کہہ دیا کہ بخیر و عافیت سکندر آباد میں ہیں۔ جب مَیں نے ان سے کہا کہ کیا وہ تمھارے آشنا ہیں؟ انھوں نے کہا: صاحب وہ بزرگ اور استاد ہیں مَیں ان کا شاگرد ہوں۔ کہیں مدرسے کے علاقے میں نوکر ہیں۔ بہ سبیل ڈاک یہاں آئے تھے اور آج ہی بسبیل ڈاک انبالے کو گئے۔ انبالہ ان کا وطن ہے اور نوکر بھی وہ اسی ضلع میں ہیں۔

نگاشتہ دوشنبہ ۲۶ جنوری ۱۸۵۹ء غالب

(۳۷)

صاحب!

ہم تمھارے اخبار نویس ہیں اور تم کو خبر دیتے ہیں کہ برخوردار میر بادشاہ آئے ہیں۔ ان کو دیکھ کر خوش ہوا۔ وہ اپنے بھائیوں سے مل کر شاد ہوئے۔ تمھارا حال سن کر مجھ کو رنج ہوا۔ کیا کروں، نہ اپنے رنج کا چارہ کر سکتا ہوں، نہ اپنے عزیزوں کی خبر لے سکتا ہوں:

ہر آنچہ ساقی ما ریخت عین الطاف است

آج چوتھا دن ہے یعنی منگل کے دن کوئی پہر بھر دن چڑھا ہوگا کہ راجا امید سنگھ بہادر ناگاہ میرے گھر تشریف لائے۔ پوچھا گیا کہ کہاں سے آئے ہو؟ فرمایا کہ آگرے سے آتا ہوں۔ ''بسانون کی گلی'' میں جو ''حکیموں کی گلی'' کے قریب ہے ''جورس صاحب'' کی کوٹھی انھوں نے مول لی ہے اور اس کے قریب کی زمین افتادہ بھی خریدی ہے اور اس کو بنوا رہے ہیں۔ تمھارا ذکر میں نے کیا کہ ہر خط میں تم کو پوچھتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ میں نے کئی خط بھیجے۔ جواب نہیں آیا۔ بولے کہ ایک خط ان کا آیا تھا، اُس کا جواب لکھ چکا ہوں۔ پھر اُن کا کوئی خط نہیں آیا۔

بہر حال میرے پھوڑے نکل رہے ہیں۔ میں باز دید کو نہیں گیا۔ شاید آج وہ گئے ہوں یا جاویں۔ پھر اکبر آباد کو جائیں گے۔ میں آج آدمی ان کے پاس بھیجوں گا۔ کل مرزا حاتم علی مہر کا خط آیا تھا۔ تم کو بہت پوچھتے تھے کہ آیا میر زا تفتہ کہاں ہیں اور کس طرح ہیں؟ بھائی ان کو خط لکھ بھیجو۔

محررہ ۱۷ جون ۱۸۵۹ء غالب

(۳۸)

میاں!

تمھارے انتقالات ذہن نے مارا۔ میں نے کب کہا تھا کہ تمھارا کلام اچھا نہیں؟ میں نے کب کہا تھا کہ دنیا میں کوئی سخن فہم و قدر دان نہ ہوگا؟ مگر بات یہ ہے کہ تم مشق سخن کر رہے ہو اور میں مشق فنا میں مستغرق ہوں۔ بوعلی سینا کے علم کو اور نظیری کے شعر کو ضائع اور بے فائدہ اور موہوم جانتا ہوں۔ زیست بسر کرنے کو کچھ تھوڑی سے راحت درکار ہے اور باقی حکمت اور سلطنت اور شاعری اور ساحری سب خرافات ہے۔ ہندوؤں میں اگر کوئی اوتار ہوا تو کیا اور مسلمانوں میں نبی بنا تو کیا؟ دنیا میں نامور ہوئے تو کیا اور گمنام جیے تو کیا؟ کچھ وجہ معاش ہو اور کچھ صحت جسمانی۔ باقی سب وہم ہے اے یار جانی۔ ہر چند وہ بھی وہم ہے۔ مگر میں ابھی اسی پایے پر ہوں۔ شاید آگے بڑھ کر یہ پردہ بھی اُٹھ جائے اور وجہ معیشت اور صحت و راحت سے بھی گزر جاؤں، عالم بیرنگی

میں گزر پاؤں۔ جس سناٹے میں ہوں وہاں تمام عالم بلکہ دونوں عالم کا پتہ نہیں۔ ہر کسی کا جواب مطابق سوال کے دیے جاتا ہوں اور جس سے جو معاملہ ہے اس کو ویسا ہی برت رہا ہوں لیکن سب کو وہم جانتا ہوں۔ یہ دریا نہیں ہے سُراب ہے۔ ہستی نہیں پندار ہے۔ ہم تم دونوں اچھے خاصے شاعر ہیں۔ مانا کہ سعدی و حافظ کے برابر مشہور رہیں گے۔ اُن کو شہرت سے کیا حاصل ہوا کہ ہم تم کو ہوگا؟

قطعات تاریخ آگرے کیونکر بھیجوں؟ پھر تمھارے پاس بھیجتا ہوں۔ ''خالق معنی بمعنی'' ''معنی آفریں'' صحیح اور مسلم اور جائز، لیکن جس طرح اللہ میں مشدد لام کو دو لام کے قائم مقام قرار دیا ہے الٰہ اور الٰہی میں الف ممدودہ کو دوسرا الف کیونکر سمجھیں؟ قیاس کام نہیں آتا اتفاق سلف شرط ہے۔ جب اور کسی نے الٰہی میں دو الف نہیں مانے تو ہم کیونکر مانیں؟

''دوئم'' بروزن ''جوئم'' غلط۔ ''دوم'' ہے بغیر تحتانی۔ بالفرض تحتانی بھی لکھیں گے تو ''دُیم'' پڑھیں گے اگرچہ لکھیں گے دوئم۔ واو کا اعلان ٹکسال باہر ہے۔ ہاں ''دومی'' درست ہے مگر نہ بہ حذف تحتانی مثل ''زمی'' بہ حذف نون (زمین) بلکہ بطریق قلب بعض ''دوئم'' کا ''دومی'' ہو گیا۔ کنوئے کی تاریخ کو بے تامل بھیج دو اور تاریخ وفات کا اور مادہ سوچو کس واسطے کہ جب الٰہی میں سے ایک الف لیا تو ایک عدد کم ہو جائے گا۔ والدعا

روز ورود نامہ بعد خواندن نوشتہ شد۔ یک شنبہ　　　　از غالب

(۳۹)

صاحب!

تمھارا خط آیا، حال معلوم ہوا:

جہانیاں ز تو برگشتہ اند اگر غالب
ترا چہ باک؟ خدائے کہ داشتی داری

خدا کے واسطے میرے باب میں لوگوں نے کیا خبر مشہور کی ہے؟ بہ نسبت حکیم احسن اللہ خاں کے جو بات مشہور ہے وہ محض غلط۔ ہاں مرزا الٰہی بخش جو شہزادوں میں ہیں اُن کو حکم کراچی

بندر جانے کا ہے اور وہ انکار کر رہے ہیں۔ دیکھیے کیا ہو؟ حکیم جی کوان کی حویلیاں مل گئی ہیں۔ اب وہ مع قبائل ان مکانوں میں جا رہے ہیں۔ اتنا حکم ان کو ہے کہ شہر سے باہر نہ جائیں۔ رہا میں:

تو بیکسی و غریبی ترا کہ می پُرسد

نہ جزا' نہ سزا' نہ نفریں' نہ آفریں' نہ عدل' نہ ظلم' نہ لطف' نہ قہر۔ پندرہ دن پہلے تک دن کو روٹی' رات کو شراب ملتی تھی' اب صرف روٹی ملے جاتی ہے شراب نہیں۔ کپڑا ایّامِ تحتم کا بنا ہوا ابھی ہے۔ اس کی فکر کچھ نہیں ہے۔ مگر تم کو میرے سر کی قسم' یہ لکھ بھیجو کہ میری خبر تم نے کیا سنی؟ مجھے اس کے معلوم ہونے سے مزا ملے گا۔

شنبہ ۵ نومبر ۱۸۵۹ء غالب

(۴۰)

میری جان!

آخر لڑکے ہو' بات کو نہ سمجھے۔ میں اور تفتہ کا اپنے پاس ہونا غنیمت نہ جانوں؟ میں نے یہ لکھا تھا کہ بشرطِ اقامت بلاؤں گا اور پھر لکھتا ہوں کہ اگر میری اقامت یہاں کی ٹھہری' تو بے تمھارے نہ رہوں گا' نہ رہوں گا' زنہار نہ رہوں گا۔ منشی بالمکند بے صبر کا خط بلند شہر سے دلی اور دلی سے رام پور پہنچا' تلف نہیں ہوا۔ اگر میں یہاں رہ گیا تو یہاں سے' اور اگر دلّی چلا گیا تو وہاں سے اصلاح دے کر اُن کے اشعار بھیج دوں گا۔ بے صبر کو اب کی بار مہینے بھر کا صبر چاہیے۔ وہ لفافہ بدستور رکھا ہوا ہے۔ از بسکہ یہاں کے حضرات مہربانی فرماتے ہیں اور ہر وقت آتے ہیں۔ فرصت مشاہدہ اوراق نہیں ملی۔ تم اسی رقعے کو ان کے پاس بھیج دینا۔

سہ شنبہ ۱۴ فروری ۱۸۶۰ء غالب

(۴۱)

میرزا تفتہ!

اس غمزدگی میں مجھ کو ہنسانا تمھارا ہی کام ہے۔ بھائی' ''تضمینِ گلستاں'' چھپوا کر کیا

فائدہ اٹھایا ہے؟ جو انطباع ''سبلستان'' سے نفع اٹھاؤ گے؟ روپیہ جمع رہنے دو۔ آمد اچھی چیز ہے اگر چہ قلیل ہو' اور اگر روپیہ لینا منظور ہے تو ہرگز اندیشہ نہ کرو اور درخواست دے دو۔ بعد نو مہینے کے روپیہ تم کو مل جائے گا۔ یہ میرا ذمہ کہ اس نو مہینے میں کوئی انقلاب واقع نہ ہوگا۔ اگر احیاناً ہوا بھی تو ہوتے ہوتے اس کو مدت چاہیے۔ ''رستخیز بیجا'' ہو چکا۔ اب ہو تو رستخیز ہو یعنی قیامت اور اس کا حال معلوم نہیں کہ کب ہوگی۔ اگر اعداد کے حساب سے دیکھو تو بھی رستخیز کے ۱۲۷۷ ہوتے ہیں۔ احتمالِ فتنہ سال آئندہ پر رہا' سو بھی موہوم۔

میاں' مَیں جو آخر جنوری کو رام پور جا کر آخر مارچ کو یہاں آ گیا ہوں' تو کیا کہوں کہ یہاں کے لوگ میرے حق میں کیا کچھ کہتے ہیں' ایک گروہ کا قول ہے کہ یہ شخص والی رام پور کا استاد تھا اور وہاں گیا تھا۔ اگر نواب نے کچھ سلوک نہ کیا ہوگا تو بھی پانچ ہزار روپے سے کم نہ دیا ہوگا۔ ایک جماعت کہتی ہے کہ نوکری کو گئے تھے مگر نوکر نہ رکھا۔ ایک فرقہ کہتا ہے کہ نواب نے نوکر رکھ لیا تھا۔ دو سو روپے مہینہ کر دیا تھا۔ لفٹنٹ گورنر الہ آباد جو رام پور آئے اور ان کو غالب کا وہاں ہونا معلوم ہوا تو انھوں نے نواب صاحب سے کہا کہ اگر ہماری خوشنودی چاہتے ہو تو اس کو جواب دو۔ نواب صاحب نے برطرف کر دیا۔ یہ تو سب سن لیا۔ اب تم اصل حقیقت سنو۔ نواب یوسف علی خاں بہادر اکتیس برس کے میرے دوست اور پانچ چھ برس سے میرے شاگرد ہیں۔ آگے گاہ گاہ کچھ بھیج دیا کرتے تھے۔ اب جولائی ۱۸۵۹ء سے سو روپے مہینہ ماہ بماہ بھیجتے ہیں۔ بلاتے رہتے تھے۔ اب میں گیا۔ دو مہینے رہ کر چلا آیا۔ بشرط حیات بعد برسات کے پھر جاؤں گا۔ وہ سو روپیہ مہینہ یہاں رہوں' وہاں رہوں' خدا کے ہاں سے میرا مقرر ہے۔

۳۰ مارچ ۱۸۶۰ء غالب

(۴۲)

بھائی' آج اس وقت تمھارا خط پہنچا۔ پڑھتے ہی جواب لکھتا ہوں۔ زر سہ سالہ مجتمعہ ہزاروں کہاں سے ہوتے۔ سات سو پچاس روپے سال پاتا ہوں۔ تین برس کے دو ہزار دو سو پچاس ہوئے۔ سو روپے مجھے مددِ خرچ ملے تھے' وہ کٹ گئے۔ ڈیڑھ سو متفرقات میں گئے۔ رہے دو ہزار روپے' میرا مختار کار ایک بنیا ہے اور مَیں اس کا قرضدار قدیم ہوں۔ اب وہ دو ہزار (روپے)

لایا' اس نے اپنے پاس رکھ لئے اور مجھ سے کہا کہ میرا حساب کیجیے۔ سات کم پندرہ سواس کے سود مول کے ہوئے۔ قرض متفرق کا اسی سے حساب کروایا گیا۔ گیارہ سوکئی روپے وہ نکلے۔ پندرہ اور گیارہ چھبیس (۲۶) ہوئے۔ اصل میں یعنی دو ہزار میں چھ سو کا گھاٹا۔ وہ کہتا ہے پندرہ سو میرے دے دو' پانسوسات روپے باقی کے تم لے لو۔ میں کہتا ہوں' متفرقات گیارہ سو چکا دے' نوسو باقی رہے' آدھے تو لے لے آدھے مجھ کو دے۔ پرسوں چوتھی کو وہ روپے لایا ہے' کل تک قصہ نہیں چکا۔ میں جلدی نہیں کرتا۔ دو ایک مہاجن بیچ میں ہیں۔ ہفتے میں جھگڑا فیصل ہو جائے گا۔ خدا کرے یہ خط تم کو پہنچ جائے۔ جس دن برات سے پھر کر آ ؤ' اسی دن مجھ کو اپنے ورود مسعود کی خبر دینا۔ والدعا

شنبہ ششم مئی ۱۸۶۰ء ہنگام نیمروز غالب

(۴۳)

اجی مرزا تفتہ!

تم نے روپیہ بھی کھویا اور اپنی فکر کو اور میری اصلاح کو بھی ڈبویا۔ ہائے کیا بری کاپی ہے۔ اپنے اشعار کی اور اس کاپی کی مثال جب تم پر کھلتی کہ تم یہاں ہوتے اور بیگمات قلعہ کو چلتے پھرتے دیکھتے۔ صورت ماہ دو ہفتہ کی سی اور کپڑے میلے' پائچے لیرلیر' جوتی ٹوٹی' یہ مبالغہ نہیں بلکہ بے تکلف "سنبلستان" ایک معشوق خوبرو ہے' بد لباس ہے۔ بہ ہر حال دونوں لڑکوں کو دونوں جلدیں دے دیں اور معلم کو حکم دیا کہ اس کا سبق دے۔ چنانچہ آج سے شروع ہو گیا۔

مرقومہ صبح شنبہ ۱۹ ماہ اپریل ۱۸۶۱ء غالب

(۴۴)

میرزا تفتہ'

جو کچھ تم نے لکھا ہے' یہ بے دردی ہے اور بدگمانی۔ معاذ اللہ تم سے اور آزردگی؟ مجھ کو اس پر ناز ہے کہ میں ہندوستان میں ایک دوست صادق الولاء رکھتا ہوں۔ جس کا ہرگوپال نام اور

تفتہ تخلص ہے۔تم ایسی کونسی بات لکھو گے کہ موجب ملال ہو؟ رہا غماز کا کہنا' اس کا حال یہ ہے کہ میرا حقیقی بھائی کُل ایک تھا۔وہ تیس برس دیوانہ رہ کر مرگیا۔مثلاً وہ جیتا ہوتا اور ہوشیار ہوتا اور تمھاری برائی کہتا تو میں اس کو جھڑک دیتا اور اس سے آزردہ ہوتا۔ بھائی' مجھ میں اب کچھ باقی نہیں ہے۔ برسات کی مصیبت گزر گئی لیکن بڑھاپے کی شدت بڑھ گئی۔تمام دن پڑا رہتا ہوں' بیٹھ نہیں سکتا۔ اکثر لیٹے لیٹے لکھتا ہوں۔معہذا یہ بھی ہے کہ اب مشق تمھاری پختہ ہوگئی۔خاطر میری جمع ہے کہ اب اصلاح کی حاجت نہ پاؤ گے۔اس سے بڑھ کر یہ بات ہے کہ قصائد سب عاشقانہ ہیں' بکار آمدنی نہیں۔خیر کبھی دیکھ لوں گا۔جلدی کیا ہے۔تین بات جمع ہوئیں: میری کاہلی' تمھارے کلام کا محتاج بہ اصلاح نہ ہونا' کسی قصیدے سے کسی طرح کے نفع کا تصور نہ ہونا۔نظر ان مراتب پر' کاغذ پڑے رہے۔لالہ بالمکند بے صبر کا ایک پارسل آیا ہے کہ جس کو بہت دن ہوئے۔آج تک سرنامہ بھی نہیں کھولا۔نواب صاحب کی دس پندرہ غزلیں پڑی ہوئی ہیں۔

ضعف نے غالب نکما کر دیا ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

یہ قصیدہ تمھارا کل آیا۔آج اس وقت کہ سورج بلند نہیں ہوا' اس کو دیکھا' اصلاح کیا' آدمی کے ہاتھ ڈاک گھر بھجوایا۔

۲۷ نومبر ۱۸۶۲ء غالب

(۴۵)

حضرت'

پرسوں صبح کو تمھارے سب کاغذ ایک لفافے میں بند کر کے ڈاک گھر بھجوا دیے۔سمجھا کہ اب چند روز کو جان بچی۔اسی دن شام کو ایک خط آپ کا اور پہنچا۔اس کو بھی روانہ کرتا ہوں۔اپنا حال پرسوں کے خط میں مفصل لکھ چکا ہوں۔ادنیٰ بات یہ ہے کہ جو کچھ لکھتا ہوں' وہ لیٹے لیٹے لکھتا ہوں۔مزے کی بات یہ ہے کہ میرا لکھا ہوا میرا حال باور نہیں' اور کسی نے جو کہہ دیا کہ غالب کے پانو کا ورم اچھا ہو گیا اور اب وہ شراب دن کو بھی پیتا ہے تو حضور نے ان باتوں کو یقین جانا۔بیس برس آگے یہ بات تھی کہ ابر و باراں میں یا پیش از طعام یا قریب شام تین گلاس پی لیتا تھا اور شراب

شبانہ معمولی میں بھرا نہ لیتا تھا' اس بیس برس میں بیس برساتیں ہوئیں۔ بڑے بڑے مینہ برسے۔ پینا ایک طرف دل میں خیال بھی نہ گزرا' بلکہ رات کی شراب کی مقدار کم ہو گئی۔ پانو کا ورم حد سے زیادہ گزر گیا۔ مادہ تحلیل کے قابل نہ نکلا۔ کھولن شروع ہو گئی۔ حکماء جو دو تین یہاں ہیں' ان کی رائے کے مطابق کل سے نیب کا بُھرتا بندھے گا۔ وہ پکا لائے گا تب اس کو پھوڑنے کی تدبیر کی جائے گی۔ تلوا زخمی' پنڈلی زخمی۔ اگر وہ نامرد بے درد جھوٹا ہے تو اس پر لعنت اور اگر میں جھوٹا ہوں تو مجھ پر سو ہزار لعنت!

غالب

(۴۶)

سچ ہے' اگر آپ استاد کا مصرع نہ لکھتے تو میں "بروئے استادن رنگ" کو کہاں سے سمجھتا:

بہ از من نصیحت گرے بایدت ندانم پس از من چہ پیش آیدت

مَیں نے جو لکھا کہ مَیں اچھا ہوں' اس کو آپ سچ سمجھ کر خدا کا شکر بجالائے۔ وہ جو میں نے لکھا تھا کہ شدت مرض کا بیان مبالغہ شاعرانہ ہے' اس کو بھی آپ نے سچ جانا ہوگا۔ حالانکہ یہ دونوں کلمے از راہ طنز تھے۔ مَیں جھوٹ سے بیزار ہوں اور جھوٹے کو ملعون جانتا ہوں۔ کبھی جھوٹ نہیں بولتا۔ جب تم نے کسی طرح بیان واقعی کو باور نہ کیا تو مَیں نے تمھیں لکھ بھیجا کہ اچھا ہوں' اور یہ کلمہ تمھیں مَیں نے جب لکھا ہے کہ عہد کر لیا ہے کہ جب تک دم میں دم اور ہاتھ میں جنبش قلم ہے' جب تک موقع اصلاح خیال میں آسکتا ہے آج جو تمھارا دفتر پہنچے گا' اس کو کل روانہ کر دیا کروں گا۔

مجملاً حال میرا یہ ہے کہ قریب بمرگ ہوں۔ دونوں ہاتھوں میں پھوڑے' پانو میں ورم۔ نہ وہ اچھے ہوتے ہیں نہ یہ رفع ہوتا ہے۔ بیٹھ نہیں سکتا۔ لیٹے لیٹے لکھتا ہوں۔ کل تمھارا دو ورقہ آیا۔ آج صبح کو لیٹے لیٹے اس کو دیکھ کر تمھیں بھجوایا۔ زنہار تم مجھے تندرست سمجھے جاؤ اور دفتر کے دفتر بھیجتے رہو۔ ایک دن سے زیادہ توقف نہ کروں گا۔ قریب مرگ ہوں تو بلا سے۔

پنجشنبہ ۲۳ جولائی ۱۸۶۳ء غالب

(۴۷)

لاحول ولاقوۃ' کس ملعون نے بہ سبب ذوقِ شعر، اشعار کی اصلاح منظور رکھی۔ اگر میں شعر سے بیزار نہ ہوں تو میرا خدا مجھ سے بیزار۔ میں نے تو بطریق قہر درویش بجان درویش لکھا تھا۔ جیسے اچھی جورو بُرے خاوند کے ساتھ مرنا بھرنا اختیار کرتی ہے' میرا تمھارے ساتھ وہ معاملہ ہے۔ (غالب)

(۴۸)

نورچشم غالب ' ازخودرفتہ ' مرزاتفتہ '

خدا تم کو خوش اور تندرست رکھے۔ نہ دوست بخیل نہ میں کاذب۔ مگر بقول میرتقی:

اتفاقات ہیں زمانے کے

بہ ہر حال کچھ تدبیر کی جائے گی اور انشاءاللہ صورت وقوع جلد نظر آئے گی۔ تعجب ہے کہ اس سفر میں کچھ فائدہ نہ ہوا:

یا کرم خود نماند در عالم یا مگر کس دریں زمانہ نہ کرد

اغنیائے دہر کی مدح سرائی موقوف کرو۔ اشعار عاشقانہ بطریق غزل کہا کرو اور خوش رہا کرو۔

سہ شنبہ' ۲۴ نومبر ۱۸۶۳ء نجات کا طالب، غالب

(۴۹)

بھائی'

تم سچ کہتے ہو کہ بہت مسودے اصلاح کے واسطے فراہم ہوئے ہیں' مگر یہ سمجھنا کہ تمھارے ہی قصائد پڑے ہیں۔ نواب صاحب کی غزلیں بھی اسی طرح دھری ہوئی ہیں۔ برسات کا حال تمھیں بھی معلوم ہے اور یہ بھی تم جانتے ہو کہ میرا مکان گھر کا نہیں ہے' کرائے کی حویلی میں رہتا ہوں۔ جولائی سے مینہ شروع ہوا۔ شہر میں سینکڑوں مکان گرے اور مینہ کی نئی صورت' دن میں دو چار بار برسے اور ہر بار اس زور سے کہ ندی نالے بہہ نکلیں۔ بالا خانے کا جو دالان میرے اٹھنے

بیٹھنے، سونے جاگنے، جینے مرنے کا محل ہے اگر چہ گرا نہیں لیکن چھت چھلنی ہو گئی۔ کہیں لگن، کہیں چلمچی، کہیں اگالدان رکھ دیا۔ قلمدان، کتابیں اٹھا کر توشے خانے کی کوٹھڑی میں رکھ دیے۔ مالک مرمت کی طرف متوجہ نہیں۔ کشتی نوح میں تین مہینے رہنے کا اتفاق ہوا۔ اب نجات ہوئی۔ نواب صاحب کی غزلیں اور تمھارے قصائد دیکھے جائیں گے۔

میر بادشاہ میرے پاس آئے تھے۔ تمھاری خیر و عافیت ان سے معلوم ہوئی تھی۔ میر قاسم علی صاحب مجھ سے نہیں ملے۔ پرسوں سے نواب مصطفیٰ خاں صاحب یہاں آئے ہوئے ہیں۔ ایک ملاقات اُن سے ہوئی ہے۔ ابھی یہیں رہیں گے۔ بیمار ہیں۔ احسن اللہ خاں معالج ہیں۔ فصد ہو چکی ہے۔ جونکیں لگ چکی ہیں۔ اب مسہل کی فکر ہے۔ سوا اس کے سب طرح کی خیر و عافیت ہے۔ میں ناتوان بہت ہو گیا ہوں، گویا صاحب فراش ہوں۔ کوئی شخص نیا تکلف کی مودت کا آ جائے تو اٹھ بیٹھتا ہوں، ورنہ پڑا رہتا ہوں۔ لیٹے لیٹے خط لکھتا ہوں۔ لیٹے لیٹے مسودات دیکھتا ہوں۔ اللہ اللہ!

صبح جمعہ ۱۴۔ ماہ اکتوبر ۱۸۶۴ء غالب

(۵۰)

آ و میرزا تفتہ، میرے گلے لگ جاؤ اور میری حقیقت سنو۔ یک شنبہ کو مولوی مظہر الحق آئے تھے۔ ان سے سب حال معلوم ہوا۔ پہلا خط تم کو ان کے بھائی مولوی انوار الحق نے بموجب حکم ریٹی گن صاحب کے لکھا تھا۔ پھر ایک خط صاحب نے آپ مسودہ کر کے اپنی طرف سے تم کو لکھا۔ دونوں دیوان تمھارے اور نشتر عشق اور ایک تذکرہ یہ چار کتابیں تمھاری بھیجی ہوئی اُن کو پہنچیں۔ صاحب تم سے بہت خوش اور تمھارے معتقد ہیں۔ کہتے ہیں کہ ہم جانتے ہیں اتنا بڑا شاعر کوئی اور ہندوستان میں نہ ہو گا کہ جو پچاس ہزار بیت کا مالک ہو۔ فائدہ اس التفات کا یہ کہ تمھارا ذکر بہت اچھی طرح لکھیں گے۔ باقی مابخیر شما بسلامت۔ ہاں ان کے تحت میں پندرہ بیس روپے مشاہرے کے علاقے ہیں۔ اگر تمھاری اجازت ہو تو اس امر میں ان سے کلام کروں۔

میرا عجب حال ہے، حیران ہوں کہ تمھیں میرا کلام کیوں باور نہیں آتا؟

گمان زیست بود بر منت ز بیدردی
بدست مرگ ولے برتر از گمان تو نیست

سامعہ مرگیا تھا۔ اب باصرہ بھی ضعیف ہوگیا۔ جتنی قوتیں انسان میں ہوتی ہیں' سب مضمحل ہیں۔ حواس سراسر مختل ہیں۔ حافظہ گویا کبھی نہ تھا۔ شعر کے فن سے گویا کبھی مناسبت نہ تھی۔ رئیس رام پور سو روپیہ مہینہ دیتے ہیں۔ سال گزشتہ اُن کو لکھ بھیجا کہ اصلاح حواس کا کام ہے اور مَیں اپنے میں حواس نہیں پاتا۔ متوقع ہوں کہ اس خدمت سے معاف رہوں' جو کچھ مجھے آپ کی سرکار سے ملتا ہے' عوض خدمات سابقہ میں شمار کیجئے تو مَیں سکہ لمبر سہی ورنہ خیرات خوار سہی اور اگر یہ عطیہ بشرط خدمت ہے تو جو آپ کی مرضی ہے' وہی میری قسمت ہے۔ برس دن سے کلام نہیں آتا۔ فتوح مقرری نومبر تک آئی۔ اب دیکھئے آگے کیا ہوتا ہے۔ آج تک نواب صاحب از راہ جوانمردی دیے جاتے ہیں اور بھائی تمھاری مشق چشم بددور صاف ہوگئی۔ رطب و یابس تمھارے کلام میں نہیں رہا اور اگر خواہی نخواہی تمھارا عقیدہ یہی ہے کہ اصلاح ضرور ہے' تو میری جان میرے بعد کیا کرو گے؟ مَیں چراغ دم صبح و آفتاب سرکوہ ہوں۔ انا اللہ وانا الیہ راجعون۔

۱۴ ار جب ۱۲۸۱ھ مطابق ۱۴ ادسمبر ۱۸۶۴ء — نجات کا طالب غالب

(۵۱)

منشی صاحب سعادت و اقبال نشان منشی ہرگوپال صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ غالب کی دعائے درویشانہ قبول کریں۔ ہم آپ کو سکندر آباد قانون گویوں کے محلے میں سمجھے ہوئے ہیں اور آپ لکھنؤ راجا مان سنگھ کی حویلی' مطبع اودھ اخبار میں بیٹھے ہوئے مدار یہ حقہ لکھنؤ کا پی رہے ہیں اور منشی نولکشور صاحب سے باتیں کر رہے ہیں۔ بھلا منشی صاحب کو میرا سلام کہنا۔ آج یک شنبہ ہے' اخبار کا لفافہ ابھی تک نہیں پہنچا۔ ہر ہفتے کو پنجشنبہ جمعہ کو پہنچتا ہے۔

مرزا تفتہ کیا فرماتے ہو؟ کیسے ریٹی گن صاحب' کہاں ریٹی گن صاحب! پنجشنبہ کے دن ۱۹ جنوری سنہ حال کو وہ پنجاب کو گئے۔ ملتان یا پشاور کے ضلعے میں کہیں کے حاکم ہوئے ہیں۔

اپنی ناتوانی کے سبب ان کی ملاقات تو دیکھی نہیں گیا۔ انوارالحق گھاٹ پر نوکر ہیں۔ پندرہ روپے مشاہرہ پاتے ہیں۔ زیادہ زیادہ۔

صبح یک شنبہ ۱۲ فروری ۱۸۶۵ء نجات کا طالب، غالب

(۵۲)

میرے مہربان، میری جان، میرزا تفتہ سخندان !

تمھارا سکندرآباد اور میرے خط کا تمھارے پاس پہنچنا تمھاری تحریر سے معلوم ہوا۔ زندہ رہو اور خوش رہو۔ میں نثر کی داد اور نظم کا صلہ مانگنے نہیں آیا، بھیک مانگنے آیا۔ روٹی اپنی گرہ سے نہیں کھاتا، سرکار سے ملتی ہے۔ وقت رخصت میری قسمت اور منعم کی ہمت۔ نواب صاحب از روئے صورت روح مجسم اور باعتبار اخلاق، آیت رحمت ہیں۔ خزانہ فیض کے تحویلدار ہیں۔ جو شخص دفتر ازل سے جو کچھ لکھوالایا ہے، اس کے بٹنے میں دیر نہیں لگتی۔ ایک لاکھ کئی ہزار روپے سال غلے کا محصول معاف کر دیا۔ ایک اہل کار پر ساٹھ ہزار کا محاسبہ معاف کیا اور بیس ہزار روپیہ نقد دیا۔ منشی نو لکشور صاحب کی عرضی پیش ہوئی۔ خلاصہ عرضی کا سن لیا، واسطے منشی صاحب کے کچھ عطیہ بتقریب شادی صبیہ تجویز ہو رہا ہے۔ مقدار مجھ پر نہیں کھلی۔ مصطفےٰ خاں صاحب بتقریب تہنیت مسندنشینی و شمول جشن آنے والے ہیں۔ اس وقت تک نہیں آئے۔ جشن یکم دسمبر سے شروع، ۵ دسمبر کو خلعت کا آنا مسموع۔

دوشنبہ ۲۸ نومبر ۱۸۶۵ء بوقت چاشت نجات کا طالب، غالب

(۵۳)

لو صاحب،

کھچڑی کھائی دن بہلائے کپڑے پھاٹے گھر کو آئے

۸ جنوری ماہ و سال حال، دوشنبہ کے دن غضب الٰہی کی طرح اپنے گھر پر نازل ہوا۔ تمھارا خط مضامین دردناک سے بھرا ہوا رام پور میں میں نے پایا۔ جواب لکھنے کی فرصت نہ ملی۔ بعد روانگی کے مرادآباد میں پہنچ کر بیمار ہو گیا۔ پانچ دن صدرالصدور صاحب کے ہاں پڑا رہا۔

انھوں نے بیمارداری اور غمخواری بہت کی۔ کیوں ترکِ لباس کرتے ہو؟ پہننے کو تمھارے پاس ہے کیا جس کو اُتار پھینکو گے؟ ترکِ لباس سے قیدِ ہستی مٹ نہ جائے گی۔ بغیر کھائے پیے گزارا نہ ہو گا۔ سختی وسستی، رنج و آرام کو ہموار کر دو۔ جس طرح ہو اسی صورت سے بہر صورت گزرنے دو۔

تاب لائے ہی بنے گی غالب
واقعہ سخت ہے اور جان عزیز

(جنوری ۱۸۶۶ء) اس خط کی رسید کا طالب، غالب

(۵۴)

میرزا تفتہ صاحب،

پرسوں تمھارا دوسرا خط پہنچا۔ تم سے پردا کیا ہے، ایک فتوح کا منتظر ہوں۔ اس میں مَیں نے اپنے ضمیر میں تم کو شریک کر رکھا ہے۔ زمانہ فتوح کے آنے کے قریب آ گیا ہے۔ انشاء اللہ خط میرا مع حصۂ فتوح جلد پہنچے گا۔ پنڈت بدری داس ڈاک منشی کرنال با آنکہ مجھ سے اس سے ملاقات ظاہری نہیں ہے۔ مگر مَیں جب جیتا تھا تو وہ اپنا کلام اصلاح کے واسطے میرے پاس بھیجتا تھا۔ بعد اپنے مرنے کے مَیں نے اس کو لکھ بھیجا کہ اب تم اپنا کلام منشی ہرگوپال تفتہ کے پاس بھیج دیا کرو۔ اب تم کو بھی لکھتا ہوں کہ تم میرے اس لکھنے کی ان کو اطلاع لکھو۔ مَیں زندہ ہوں۔ اوپر کے لمبر میں جواپنے کو مردہ لکھا ہے، وہ باعتبار ترکِ اصلاحِ نظم لکھا ہے، ورنہ زندہ ہوں، مردہ نہیں، بیمار بھی نہیں۔ بوڑھا، ناتوان، مفلس، قرضدار، کانوں کا بہرہ، قسمت کا بے بہرہ، زیست سے بیزار، مرگ کا امیدوار۔

غالب

مرزا حاتم علی بیگ مہر

(۵۵)

بہت سہی غمِ گیتی، شراب کیا کم ہے؟
غلامِ ساقیِ کوثر ہوں، مجھ کو کیا غم ہے؟

سخن میں خامۂ غالب کی آتش افشانی
یقیں ہے ہم کو بھی' لیکن اب اس میں دم کیا ہے!

علاقۂ محبت ازلی کو برحق مان کر اور پیوند غلامی جناب مرتضیٰ علی کو سچ جان کر ایک بات اور کہتا ہوں کہ بینائی اگر چہ سب کو عزیز ہے مگر شنوائی بھی تو آخر ایک چیز ہے۔ مانا کہ روشنائی اس کے اجارے میں آئی ہے' یہ بھی وسیل آشنائی ہے۔ کیا فرض ہے کہ جب تک دید وا دید نہ ہولے اپنے کو بیگانۂ یک دگر سمجھیں ' البتہ ہم تم دوست دیرینہ ہیں اگر سمجھیں۔ سلام لکھا تھا' آپ کی نظر سے گزر گیا ہو۔ احیاناً اگر نہ دیکھا ہو تو اب مرزا تفتہ سے لے کر پڑھ لیجیے گا اور خط کے لکھنے کے احسان کو اس خط کے پڑھ لینے سے دوبالا کیجیے گا۔

ہائے میجر جان جاکوب کیا جوان مارا گیا ہے۔ سچ' اس کا شیوہ یہ تھا کہ اردو کے فکر کو مانع آتا اور فارسی زبان میں شعر کہنے کی رغبت دلواتا۔ یہ بھی انہیں میں ہے کہ جن کا میں ماتمی ہوں۔ ہزار ہا دوست مر گئے۔ کس کو یاد کروں اور کس سے فریاد کروں؟ جیوں تو کوئی غمخوار نہیں' مروں تو کوئی عزادار نہیں۔

غزلیں آپ کی دیکھیں۔ سبحان اللہ' چشم بددور۔ اردو کی راہ کے تو سالک ہو' گویا اس زبان کے مالک ہو۔ فارسی بھی خوبی میں کم نہیں۔ مشق شرط ہے۔ اگر کہے جاؤ گے لطف پاؤ گے۔ میرا تو گویا بقول طالب آملی اب یہ حال ہے:

لب از گفتن چناں بستم کہ گوئی　　دہن بر چہرہ زخمے بود' بہ شد

جب آپ نے بغیر خط کے بھیجے مجھے لکھا ہو تو کیونکر مجھے اپنے خط کے جواب کی تمنا نہ ہو؟ پہلے تو اپنا حال لکھیے کہ میں نے سنا تھا آپ کہیں کے صدر امین ہیں۔ پھر اکبر آباد میں کیوں خانہ نشین ہیں؟ اس ہنگامہ میں آپ کی صحبت حکام سے کیسی رہی؟ راجہ بلوان سنگھ کا بھی حال لکھنا ضرور ہے۔ کہاں ہیں اور وہ دو ہزار روپیہ مہینہ جوان کو سرکار انگریزی سے ملتا تھا' اب بھی ملتا ہے یا نہیں؟

ہائے لکھنؤ! کچھ نہیں کھلتا کہ اس بہارستان پر کیا گزری۔ اموال کیا ہوئے ' اشخاص کہاں گئے؟ خاندان شجاع الدولہ کے زن و مرد کا انجام کیا ہوا؟ قبلہ و کعبہ مجتہد العصر کی سرگزشت کیا

ہے؟ گمان کرتا ہوں کہ بہ نسبت میرے تم کو کچھ زیادہ آگاہی ہوگی۔ امیدوار ہوں کہ جو آپ پر معلوم ہے' وہ مجھ پر مجہول نہ رہے۔ پتہ مسکن مبارک کاشمیری بازار سے زیادہ نہیں معلوم۔ ظاہراً اسی قدر کافی ہوگا' ورنہ آپ زیادہ لکھتے۔

میرزا تفتہ کو دعا کہیے گا اور ان کے اس خط کے پہنچنے کی اطلاع دیجیے گا جس میں آپ کے خط کی انہوں نے نوید لکھی تھی۔ والسلام غالب

(۵۶)

خود شکوہ دلیل رفع آزاد بس است
آید بزباں ہر آنچہ از دل برود

بندہ پرور!

فقیر شکوہ سے بُرا نہیں مانتا' مگر شکوہ کے فن کو سوائے میرے کوئی نہیں جانتا۔ شکوے کی خوبی یہ ہے کہ راہ راست سے منہ نہ موڑے اور معہذا دوسرے کے واسطے جواب کی گنجائش نہ چھوڑے۔ کیا میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ مجھ کو آپ کا فرخ آباد جانا معلوم ہو گیا تھا' اس واسطے آپ کو خط نہیں لکھا؟ کیا میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ میں نے اس عرصہ میں کئی خط بھجوائے اور وہ اُلٹے پھر آئے؟ آپ شکوہ کاہے کو کرتے ہیں' اپنا گناہ میرے ذمہ دھرتے ہیں۔ نہ جاتے وقت لکھا کہ میں کہاں جاتا ہوں' نہ وہاں جا کر لکھا کہ میں کہاں رہتا ہوں۔ کل آپ کا مہربانی نامہ آیا۔ آج میں نے اس کا جواب بھجوایا۔ کہیے اپنے دعوے میں صادق ہوں یا نہیں؟ پس دردمندوں کو زیادہ ستانا اچھا نہیں۔ مرزا تفتہ سے آپ فقط ان کے خط نہ لکھنے کے سبب سرگراں ہیں۔ میں یہ بھی نہیں جانتا کہ وہ ان دنوں کہاں ہیں۔ آج تو کلمت علی اللہ' سکندر آباد خط بھیجتا ہوں۔ دیکھوں' کیا دیکھتا ہوں۔

(۵۔ مارچ ۱۸۵۸ع) غالب

(۵۷)

بھائی صاحب،

از روئے تحریر مرزا تفتہ آپ کا چھ کتابوں کی تزئین کی طرف متوجہ ہونا معلوم ہوا۔ پھر

بھائی منشی نبی بخش صاحب نے دو بار لکھا کہ میں با جمال لکھتا ہوں مفصل مرزا حاتم علی صاحب نے لکھا ہوگا۔ یارب! ان کے دو خط آ گئے' مرزا صاحب نے اگر لکھا ہوتا تو ان کا خط کیوں نہ آتا؟ اپنے حسن اعتقاد سے یوں سمجھا کہ نہ لکھنا بمقتضائے یک دلی ہے۔ جب اپنا کام سمجھ لیتے تو مجھ کو لکھنا کیا ضرور رہے؟ مگر اس کو کیا کروں کہ جواب باتوں کا جواب نہیں۔

مطبع اخبار "آفتاب عالمتاب" میں یکم ستمبر ۱۸۵۸ع حال سے حکیم احسن اللہ خاں کا نام لکھوا دینا اور نمبروں کا اخبار ایک بار بھجوا دینا اور آئندہ ہر ہفتے اس کے ارسال کا طور ٹھہرا دینا۔ کیوں صاحب' یہ امر ایسا کیا دشوار تھا کہ آپ نے نہ کیا؟ اور اگر دشوار تھا تو اس کی اطلاع دینی کیا دشوار تھی؟ ابھی شکایت نہیں کرتا' پوچھتا ہوں کہ آیا یہ امور مقتضی شکایت ہیں یا نہیں۔ مرزا تفتہ کے ایک خط میں یہ قصہ لکھ چکا ہوں۔ کیا انھوں نے بھی وہ خط تم کو نہیں پڑھایا؟ ہر چند عقل دوڑائی، کوئی درنگ کی وجہ خیال میں نہ آئی۔ اب حصول مدعا سے قطع نظر نہیں یہ سوچ رہا ہوں کہ دیکھوں چھ مہینے بعد، برس دن بعد، اگر مرزا صاحب خط لکھتے ہیں تو اس امر خاص کا کیا جواب لکھتے ہیں۔ میں بھی شاعر ہوں۔ اگر کوئی مضمون ہوتا تو میرے خیال میں آ جاتا۔ کوئی عذر ایسا میرے ذہن میں نہیں آتا کہ قابل سماعت کے ہو۔ میں بھی تو دیکھوں تم کیا لکھتے ہو؟

۳۰ ستمبر ۱۸۵۸ع غالب

(۵۸)

بھائی صاحب،

تینتیس کتابیں ا بھیجی ہوئی برخوردار منشی شیو نرائن کی، کل جمعہ کے دن ۱۲ نومبر کو پہنچیں۔ کاغذ اور سیاہی اور خط کا حسن دیکھ کر میں نے از روئے یقین جانا کہ طلائی کام پر یہ کتابیں طاؤس بہشت بن جائیں گی، حوریں ان کو دیکھ کر شرمائیں گی۔ یہ تو سب درست، مگر دیکھیے مجھ کو ان کا دیکھنا کب تک میسر ہو؟ آپ پر گمان تساہل کا گزرے، یہ تو کیونکر ہو؟ ہاں صحاف جلد کے بنانے کی نسبت سے حق کا جلا دنہ بن جائے یعنی مدت مناسب سے زیادہ دیر نہ لگائے۔ اور ہاں حضرت، کچھ ایسی پختگی ارسال کے وقت کر لیجیے گا کہ وہ پارسل آشوب تلف سے محفوظ رہے۔ بہت عزیز اور بہت کام کی چیز ہے۔ مجھ کو وہ ایک ایک مجلد اپنی جان سے زیادہ

عزیز ہے۔ یاالٰہی! یہ خط راہ میں ہو اور وہ ساتوں کتابوں کا پارسل تیرے حفظ وامان میں مجھ تک پہنچ جائے اور یہ نہ ہو تو بھلا یہ ہو کہ اس خط کا جواب لکھیے۔ اس میں مرقوم ہو کہ آج ہم نے کتابوں کا پارسل روانہ کیا ہے۔

یا رب ایں آرزوئے من چہ خوش است
تو بدیں آرزو مرا برساں
(غالب)

مرسلہ شنبہ،۱۳ نومبر ۱۸۵۸ء

(۵۹)

بھائی جان ،

کل جو جمعہ، روز مبارک و سعید تھا، گویا میرے حق میں روز عید تھا۔ چار گھڑی دن رہے نامہ فرحت فرجام اور چار گھڑی کے بعد وقت شام:

ساتِ جلدوں کا پارسل پہنچا واہ کیا خوب، برمحل پہنچا

آدمی کو موافق اس کی تمنا کے آرزو برآنی بہت محال ہے۔ میری آرزو ایسی برآئی کہ وہ برتر از وہم وخیال ہے۔ یہ بناؤ تو میرے تصور میں بھی نہیں گزرتا تھا۔ میں صرف اس قدر خیال کرتا تھا کہ جلدیں بندھی ہوئی، دو کی لوحیں زریں اور پانچ کی لوحیں سیاہ قلم کی ہوں گی۔ واللہ! اگر تصور میں بھی گزرتا ہو کہ کتابیں اس رقم کی ہوں گی۔ جب تک جہان ہے، تم جہان میں رہو۔ آئمہ اطہار علیہم السلام کی امان میں رہو۔ میرا مقصود یہ تھا کہ ایک کتاب مثل ان چار کے بن جائے، نہ یہ کہ دو کتابوں کا سارنگ دکھلائے۔ اب میں حیران ہوں کہ آیا شمار ائمہ نے ان بارہ روپوں میں برکت دی یا کچھ تمہارا روپیہ صرف ہوا۔ دو پارسلوں کا محصول، دور جسٹریوں کا معمول، تین کتابوں کی لوحیں طلائی، یہ ساری بات اس روپے میں کیونکر بن آئی؟ اور کیونکر معلوم کروں؟ کس سے پوچھوں؟ خدا کرے، تم تکلف نہ کرو اور اس امر کے اظہار میں توقف نہ کرو۔ خفقانی آدمی کو بغیر حال معلوم ہوئے یا کسے آرام نہیں آتا۔ جہاں محبتیں دینی اور روحانی ہوں، وہاں تکلف نہیں آتا۔ زیادہ اس سے کہ شکر گزار ہوں اور شرمسار ہوں، کیا لکھوں؟

چارہ خاموشی است چیزے را کہ از تحسیں گزشت

(۶۰)

خدا کا شکر بجالاتا ہوں کہ آپ کو اپنی طرف متوجہ پاتا ہوں۔ میرزا تفتہ کا خط جو آپ نے نقل کر کے بھیج دیا ہے، مَیں نے منشی شیو نرائن کو بھیجا ہوا اصل خط دیکھ لیا ہے۔ اگر تم مناسب جانو تو ایک بات میری مانو۔ ''رقعاتِ عالمگیری'' یا ''انشاءِ خلیفہ'' اپنے سامنے رکھ لیا کرو۔ جو عبارت اس میں سے پسند آیا کرے' اپنے خط میں لکھ دیا کرو۔ خط مفت میں تمام ہو جایا کرے گا اور تمھارے خط کے آنے کا نام ہو جایا کرے گا۔ اگر کبھی کوئی قصیدہ کہا' اس کا دیکھنا مشاہدۂ اخبار پر موقوف رہا:

برات عاشقاں بر شاخِ آہو

واقعی' جو اخبار آگرہ سے دلی آتے ہیں ' وہ میرے سامنے پڑھے جاتے ہیں۔ صاحب ہوش میں آؤ اور مجھ کو بتاؤ کہ یہاں جو پارسیوں کی دکانوں میں ''فرنچ'' اور ''شام پین'' کے ورجن دھرے ہوئے ہیں یا ساہوکاروں اور جوہریوں کے گھر روپے اور جواہر سے بھرے ہوئے ہیں مَیں کہاں وہ شراب پینے جاؤں گا اور وہ مال کیوں کر اٹھاؤں گا؟ بس اب زیادہ باتیں نہ بنایئے اور وہ قصیدہ مجھ کو بھجوایئے۔ مَیں نے کتابیں جا بجا بسبیل پارسل ارسال کی ہیں' اگر چہ پہنچنے کی خبر پائی ہے مگر نوید قبول ابھی کہیں سے نہیں آئی ہے:

رات دن گردش میں ہیں سات آسماں
ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا

دیکھنا بھائی اس غزل کا مطلع کیسا ہے:

حُور سے باز آئے پر باز آئیں کیا؟
کہتے ہیں ہم تجھ کو منہ دکھلائیں کیا؟
موجِ خوں سر سے گزر ہی کیوں نہ جائے
آستانِ یار سے اُٹھ جائیں کیا؟

لاگ ہو تو اس کو ہم سمجھیں لگاؤ
جب نہ ہو کچھ بھی تو دھوکا کھائیں کیا؟
پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے؟
کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا؟

غزل ناتمام ہے:

ہے بسکہ ہر اک ان کے اشاروں میں نشاں اور
کرتے ہیں محبت تو گزرتا ہے گماں اور
تم شہر میں ہو تو ہمیں کیا غم، جب اٹھیں گے
لے آئیں گے بازار سے جا کر دل و جاں اور
لوگوں کو ہے خورشید جہاں تاب کا دھوکا
ہر روز دکھاتا ہوں میں اک داغ نہاں اور
ابرو سے ہے کیا اس نگہ ناز کو پیوند
ہے تیر مقرر، مگر اس کی ہے کماں اور
یا رب وہ نہ سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے مری بات
دے اور دل ان کو جو نہ دے مجھ کو زباں اور
ہر چند سبک دست ہوئے بت شکنی میں
ہم ہیں تو ابھی راہ میں ہے سنگ گراں اور
پاتے نہیں جب راہ تو چڑھ جاتے ہیں نالے
رکتی ہے مری طبع تو ہوتی ہے رواں اور
مرتا ہوں اس آواز پہ ہر چند سر اڑ جائے
جلاد کو لیکن وہ کہے جائیں کہ ہاں اور
ہیں اور بھی دنیا میں سخنور بہت اچھے
کہتے ہیں کہ غالب کا ہے انداز بیاں اور

دوشنبہ کا دن ۲۰ دسمبر کی صبح کا وقت ہے۔ انگیٹھی رکھی ہوئی ہے۔ آگ تاپ رہا ہوں اور خط لکھ رہا ہوں۔ یہ اشعار یاد آ گئے تم کو لکھ بھیجے۔ والسلام

(غالب) (۲۰ دسمبر ۱۸۵۸ع)

(۶۱)

شرط اسلام بود ورزش ایمان بالغیب
اے تو غائب ز نظر، مہر تو ایمان من است

حلیہ مبارک نظر افروز ہوا۔ جانتے ہو کہ میرزا یوسف علی خاں عزیز نے جو کچھ تم سے کہا، اس کا منشا کیا ہے؟ کبھی میں نے بزم احباب میں کہا ہوگا کہ مرزا حاتم علی کے دیکھنے کو جی چاہتا ہے۔ سنتا ہوں کہ وہ طرحدار آدمی ہیں اور بھائی تمھاری طرحداری کا ذکر میں نے "مغل جان" سے سنا تھا، جس زمانے میں کہ وہ نواب حامد علی خاں کے نوکر تھی اور اس میں مجھ میں بے تکلفانہ ربط تھا تو اکثر "مغل" سے پہروں اختلاط ہوا کرتے تھے۔ اس نے تمھارے شعر اپنی تعریف کے بھی مجھ کو دکھائے ہیں۔

بہر حال تمھارا حلیہ دیکھ کر تمھارے کشیدہ قامت ہونے پر مجھ کو رشک نہ آیا، کس واسطے کہ میرا قد بھی درازی میں انگشت نما ہے۔ تمھارے گندمی رنگ پر رشک نہ آیا، کس واسطے کہ جب میں جیتا تھا تو میرا رنگ چمپئی تھا اور دیدہ ور لوگ اس کی ستائش کیا کرتے تھے۔ اب جو کبھی مجھ کو اپنا رنگ یاد آتا ہے تو چھاتی پر سانپ سا پھر جاتا ہے، ہاں، مجھ کو رشک آیا اور میں نے خون جگر کھایا تو اس بات پر کہ داڑھی خوب گھٹی ہوئی ہے۔ وہ مزے یاد آ گئے۔ کیا کہوں جی پر کیا گزری۔ بقول شیخ علی حزیں:

تا دسترسم بود، ز دم چاک گریباں
شرمندگی از خرقۂ پشمینہ ندارم

جب داڑھی مونچھ میں بال سفید آ گئے، تیسرے دن چیونٹی کے انڈے گالوں پر نظر آنے لگے۔ اس سے بڑھ کر یہ ہوا کہ آگے کے دو دانت ٹوٹ گئے، ناچار مسّی بھی چھوڑ دی اور داڑھی بھی۔ مگر یہ یاد

رکھیے کہ اس بھونڈے شہر میں ایک دردی ہے عام۔ ملا، بساطی، بچہ بند، دھوبی، سقا، بھٹیارہ، جولاہا، کنجڑہ، منہ پر داڑھی، سر پر بال۔ فقیر نے جس دن داڑھی رکھی، اسی دن سر منڈایا۔ لاحول ولا قوۃ اِلّا باللہ العلی العظیم۔ کیا بک رہا ہوں۔

صاحب بندہ نے ''دستنبو'' جناب اشرف الامرا جارج فریڈرک ایڈمنسٹن صاحب بہادر لفٹنٹ گورنر بہادر غرب و شمال کی نذر بھیجی تھی۔ سوان کا فارسی خط محررہ دہم مارچ مشتمل بر تحسین و آفرین و اظہار خوشنودی بطریق ڈاک آ گیا۔ پھر میں نے تہنیت میں لفٹنٹ گورنری کے قصیدہ فارسی بھیجا۔ اس کی رسید میں نظم کی تعریف اور اپنی رضامندی پر متضمن خط فارسی بسبیل ڈاک مرقومہ چارد ہم آ گیا۔ پھر ایک قصیدہ فارسی مدح و تہنیت میں جناب رابرٹ منٹگمری صاحب بہادر لفٹنٹ گورنر بہادر پنجاب کی خدمت میں بواسطہ صاحب کمشنر بہادر دہلی بھیجا تھا۔ کل ان کا مہری خط بذریعہ صاحب کمشنر بہادر دہلی آ گیا۔ پنشن کے باب میں ابھی کچھ حکم نہیں ہوا۔ اسباب توقع فراہم ہوتے جاتے ہیں۔ دیر آید درست آید۔ اناج کھاتا ہی نہیں ہوں۔ آدھ سیر گوشت دن کو اور پاؤ بھر شراب رات کو ملے جاتی ہے:

ہر اک بات پہ کہتے ہو تم کہ تو کیا ہے؟
تمھیں کہو کہ یہ اندازِ گفتگو کیا ہے؟

اگر ہم فقیر سچے ہیں اور اس غزل کے طالب کا ذوق پکا ہے تو یہ غزل اس خط سے پہلے پہنچ گئی ہوگی۔ رہا سلام، وہ اب پہنچا دیں گے۔

(مارچ یا اپریل ۱۸۵۹ء)

(۶۲)

جنابِ مرزا صاحب،

دلّی کا حال تو یہ ہے:

گھر میں تھا کیا جو ترا غم اسے غارت کرتا
وہ جو رکھتے تھے ہم اک حسرتِ تعمیر، سو ہے

یہاں دھرا کیا ہے جو کوئی لوٹے گا۔ وہ خبر محض غلط ہے۔ اگر کچھ ہے تو یہ ہے کہ چند روز گوروں نے اہل بازار کو ستایا تھا۔ اہل قلم اور اہل فوج نے با اتفاق ہمد گر ایسا بندوبست کیا کہ وہ فساد مٹ گیا۔ اب امن و امان ہے۔ ناسخ مرحوم جو تمھارے استاد تھے' میرے بھی دوست صادق الوداد تھے۔ مگر یک فنے تھے۔ صرف غزل کہتے تھے۔ قصیدے اور مثنوی سے ان کو کچھ علاقہ نہ تھا۔ سبحان اللہ تم نے قصیدے میں وہ رنگ دکھایا کہ انشاء کو رشک آیا۔ مثنوی کے اشعار جو میں نے دیکھے' کیا کہوں کیا حظ اٹھایا:

ذرّا سے مَیں بھی چاہوں از رہِ مہر
فروغ "میرزا حاتم علی مہر"

اگر اسی انداز پر انجام پائے گی تو یہ مثنوی کارنامۂ اردو کہلائے گی۔ خدا تم کو جیتا رکھے۔ تمھارا دم غنیمت ہے۔ صاحب! میں تم سے پوچھتا ہوں کہ "معیار الشعرا" میں تم نے اپنا خط کیوں چھپوایا؟ تمھارے ہاتھ کیا آیا؟ سنو تو سہی اگر سب کا کلام اچھا ہو' تو امتیاز کیا رہے۔

(غالب)

(۶۳)

میرزا صاحب'

آپ کا غم فزا نامہ پہنچا۔ میں نے پڑھا۔ یوسف علی خاں عزیز کو پڑھوا دیا۔ انھوں نے جو میرے سامنے اس مرحومہ کا اور آپ کا معاملہ بیان کیا' یعنی اس کی اطاعت اور تمھاری اس سے محبت' سخت ملال ہوا اور رنج کمال ہوا۔ سنو صاحب' شعرا میں فردوسی اور فقرا میں حسن بصری اور عشاق میں مجنوں' یہ تین آدمی تین فن میں سر دفتر اور پیشوا ہیں۔ شاعر کا کمال یہ ہے کہ فردوسی ہو جائے' فقیر کی انتہا یہ ہے کہ حسن بصری سے ٹکر کھائے' عاشق کی نمود یہ ہے کہ مجنوں کی ہم طرحی نصیب ہو۔ لیلیٰ اس کے سامنے مری تھی' تمھاری محبوبہ تمھارے سامنے مری' بلکہ تم اس سے بڑھ کر ہوئے کہ لیلیٰ اپنے گھر میں اور تمھاری معشوقہ تمھارے گھر میں مری۔ بھئی "مغل بچے" بھی غضب ہوتے ہیں' جس پر مرتے ہیں اس کو مار رکھتے ہیں۔ میں بھی "مغل بچہ" ہوں۔ عمر بھر میں ایک بڑی ستم پیشہ ڈومنی کو میں نے بھی مار رکھا ہے۔ خدا ان دونوں کو بخشے اور ہم تم دونوں کو بھی کہ زخم مرگ

دوست کھائے ہوئے ہیں' مغفرت کرے۔ چالیس بیالیس برس کا یہ واقعہ ہے۔ با آنکہ یہ کوچہ چھٹ گیا۔ اس فن سے بیگانہ محض ہوگیا ہوں' لیکن اب بھی کبھی کبھی وہ ادائیں یاد آتی ہیں۔ اُس کا مرنا زندگی بھر نہ بھولوں گا۔ جانتا ہوں کہ تمھارے دل پر کیا گزرتی ہوگی۔ صبر کرو اور اب ہنگامۂ عشق مجازی چھوڑ دو:

سعدی اگر عاشقی کنی و جوانی　　　　عشق محمدؐ بس است و آل محمدؐ

اللہ بس ماسوا ہوس　　　　غالب

(۶۴)

مرزا صاحب'

ہم کو یہ باتیں پسند نہیں۔ پینسٹھ برس کی عمر ہے۔ پچاس برس عالم رنگ و بو کی سیر کی۔ ابتدائے شباب میں ایک مرشد کامل نے ہم کو یہ نصیحت کی کہ ہم کو زہد و ورع منظور نہیں۔ ہم مانع فسق و فجور نہیں۔ پیو' کھاؤ' مزے اُڑاؤ۔ مگر یہ یاد رہے کہ مصری کی مکھی بنو' شہد کی مکھی نہ بنو۔ سو میرا اس نصیحت پر عمل رہا ہے۔ کسی کے مرنے کا وہ غم کرے جو آپ نہ مرے۔ کیسی اشک افشانی' کہاں کی مرثیہ خوانی۔ آزادی کا شکر بجالاؤ' غم نہ کھاؤ' اور اگر ایسے ہی اپنی گرفتاری سے خوش ہو تو ''چُنّا جان'' نہ سہی ''مُنّا جان'' سہی۔ میں جب بہشت کا تصور کرتا ہوں اور سوچتا ہوں کہ اگر مغفرت ہو گئی اور ایک قصر ملا اور ایک حور ملی۔ اقامت جاودانی ہے اور اسی ایک نیک بخت کے ساتھ زندگانی ہے۔ اس تصور سے جی گھبراتا ہے اور کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ ہے ہے۔ وہ حور اجیرن ہو جائے گی۔ طبیعت کیوں نہ گھبرائے گی؟ وہی زمرّدیں کاخ اور وہی طوبیٰ کی ایک شاخ! چشم بددور' وہی ایک حور۔ بھائی ہوش میں آؤ کہیں اور دل لگاؤ:

زن نو کُن اے دوست در ہر بہار　　　　کہ تقویم پارینہ ناید بکار

میرزا مظہر کے اشعار کی تضمین کا مسدس دیکھا' فکر سراپا پسند' ذکر بہمہ جہت ناپسند' اپنے نام کا خط مع ان اشعار کے مرزا ابو یوسف علی خاں عزیز کے حوالے کیا۔

مکرمی نواب محمد علی خاں صاحب کی خدمت میں سلام۔ پروردگار ان کو سلامت رکھے۔ مولوی عبدالوہاب صاحب کو میرا سلام۔ دم دے کر مجھ سے فارسی عبارت میں خط

لکھوایا ہیں منتظر رہا کہ آپ لکھنؤ جائیں گے وہ عبارت جناب قبلہ وکعبہ کو دکھائیں گے۔ان کے مزاج اقدس کی خیر و عافیت مجھ کو رقم فرمائیں گے۔کیا جانوں کہ حضرت میرے وطن میں جلوہ افروز ہیں:

یار در خانہ و من گرد جہاں مے گردم

اب مجھے ان سے یہ استدعا ہے کہ دستخط خاص سے مجھ کو خط لکھیں اور لکھنؤ نہ جانے کا سبب اور جناب قبلہ وکعبہ کا حال جو کچھ معلوم ہو' وہ سب اس خط میں درج کریں:

(۱۸۶۰ء) غالب

منشی شیونرائن آرام

(۶۵)

برخوردار اقبال نشان منشی شیونرائن کو بعد دعا کے معلوم ہو۔تمھارے دو خط متواتر پہنچے۔ میرے بھی دو خط پس و پیش پہنچے ہوں گے۔موافق اس تحریر کے عمل کیا ہوگا۔دو جلدیں پُرتکلف اور پانچ جلدیں بہ نسبت اس کے کم تکلف مرزا حاتم علی صاحب کے عہدۂ اہتمام میں ہیں۔اس سے ہم کو اور تم کو کچھ کام نہیں،وہ جیسی چاہیں بنوا کر بھیج دیں۔تم ایک جلد،بس۔زیادہ صرف کیوں کرو؟اپنے طور پر اپنی طرف سے جیسی چاہو بنوا کر بھیج دو۔میں تم کو اپنے پیارے ناظر بنسی دھر کی نشانی جانتا ہوں۔اس کو تمھاری نشانی جان کر اپنی جان کے برابر رکھوں گا۔باقی حال اپنے خاندان اور تمھارے خاندان کا اور باہم یل کر اپنا اور بنسی دھر کا بڑے ہونا سب تم کو لکھ چکا ہوں' مکرر کیا لکھوں؟

بادشاہ کی تصویر کی یہ صورت ہے کہ اجڑا ہوا شہر،نہ آدمی نہ آدم زاد' مگر ہاں دو ایک مصوّروں کو آبادی کا حکم ہو گیا ہے۔وہ رہتے ہیں' سو وہ بھی بعد اپنے گھروں کے لٹنے کے آباد ہوئے ہیں۔تصویریں بھی اُن کے گھروں سے لُٹ گئیں۔جو کچھ ہیں' وہ صاحبان انگریز نے بڑی خواہش سے خرید کر لیں۔ایک مصور کے پاس ایک تصویر ہے' وہ تیس روپے سے کم نہیں دیتا۔کہتا

ہے کہ تین تین اشرفیوں کو میں نے صاحب لوگوں کے ہاتھ بیچی ہیں، تم کو دو اشرفی کو دوں گا۔ ہاتھی دانت کی تختی پر وہ تصویر ہے۔ میں نے چاہا کہ اس کی نقل کاغذ پر اتار دے، اس کے بھی بیس روپے مانگتا ہے۔ پھر خدا جانے اچھی ہو یا نہ ہو۔ اتنا صرف بیجا کیا ضرور ہے؟ میں نے دو ایک آدمیوں سے کہہ رکھا ہے، اگر کہیں سے ہاتھ آ جائے گی تو لے کر تم کو بھیج دوں گا۔ مصوروں سے خرید کرنے کا نہ مجھ میں مقدور، نہ تمھارا نقصان منظور۔

اب چھاپا تمام ہو گیا ہو گا۔ وہ پانچ اور دو سات کتابیں جو میرزا صاحب کی تحویل میں ہیں وہ، اور وہ ایک جلد جو تم نے مجھ کو دی کی ہے، وہ سب لوح اور جلد کی درستی کے بعد پہنچ جائیں گی، مگر وہ چالیس سرسری، جو مجھے چاہیے ہیں، وہ تو آج کل میں روانہ کر دو اور ہاں میری جان، یہ چالیس کتابوں کا پشتارہ کیونکر پہنچے اور محصول اس کا کیا ہو گا؟ اور یہ بھی تو بتاؤ کہ وہ دس جلدیں رائے امید سنگھ کے پاس کہاں بھیجی جائیں گی؟ میرزا تفتہ ہاترس کو جاتے ہوئے ان کا اندور (میں) نہ ہونا اور پھر شاید آگرہ اور دلی کا آنا مجھ کو لکھ چکے ہیں۔ ان باتوں کا جواب مجھ کو لکھو۔ تصویر کے باب میں جو کچھ لکھو وہ کروں اور ان مقدمات سے اطلاع پاؤں۔ جواب جلد لکھو اور مفصل لکھو۔

نگاشتہ و رواں داشتہ، شنبہ ۲۳ اکتوبر ۱۸۵۸ء   غالب

(۲۶)

برخوردار منشی شیو نرائن کو دعا کے بعد معلوم ہو، تصویر پہنچی، تحریر پہنچی۔ سنو میری عمر ستر برس کی ہے اور تمھارا دادا میرا ہم عمر اور باہم باز تھا اور میں نے اپنے نانا صاحب خواجہ غلام حسین مرحوم سے سنا کہ تمھارے پردادا صاحب کو اپنا دوست بتاتے تھے اور فرماتے تھے کہ میں بنسی دھر کو اپنا فرزند سمجھتا ہوں۔ غرض اس بیان سے یہ ہے کہ سو سو برس کی ہماری تمھاری ملاقات ہے۔ پھر آپس میں نامہ و پیام کی راہ و رسم نہیں اور اس راہ و رسم کے مسدود ہونے کا حاصل یہ ہے کہ ایک کو دوسرے کے حال کی خبر نہیں۔ اگر تم کو میرے حال سے آگاہی ہوتی تو مجھ کو بسبیل ڈاک کبھی اکبر آباد نہ بلاتے۔

لو اب میری حقیقت سنو۔ چھٹا مہینہ ہے کہ سید ھے ہاتھ میں ایک پھنسی نے پھوڑے

کی صورت پیدا کی۔ پھوڑا پک کر، پھوٹ کر، ایک زخم، زخم کیا ایک غار بن گیا۔ ہندوستانی جراحوں کا علاج رہا۔ بگڑتا گیا۔ دو مہینے سے کالے ڈاکٹر کا علاج ہے۔ سلائیاں دوڑ رہی ہیں۔ استرے سے گوشت کٹ رہا ہے۔ بیس دن سے صورت افاقت کی نظر آنے لگی ہے۔

اب ایک اور داستان سنو۔ غدر کے رفع ہونے اور دلّی کے فتح ہونے بعد میرا پنسن کھلا۔ چڑھا ہوا روپیہ دام دام ملا۔ آئندہ کو بدستور بے کم و کاست جاری ہوا۔ اگر لاٹ صاحب کا دربار اور خلعت جو معمولی اور مقرری تھا مسدود ہو گیا۔ یہاں تک کہ صاحب سکرتر بھی مجھ سے نہ ملے اور کہلا بھیجا کہ اب گورنمنٹ کو تم سے ملاقات کبھی منظور نہیں۔ میں فقیر متکبر، مایوس دائمی ہو کر اپنے گھر بیٹھ رہا اور حکام شہر سے بھی ملنا موقوف کر دیا۔ بڑے لاٹ صاحب کے ورود کے زمانے میں نواب لفٹنٹ گورنر بہادر پنجاب بھی دلّی میں آئے' دربار کیا۔ خیر، کرو، مجھ کو کیا؟ ناگاہ دربار کے تیسرے دن بارہ بجے چپراسی آیا اور کہا نواب لفٹنٹ گورنر نے یاد کیا ہے۔ بھائی' یہ آخر فروری ہے اور میرا حال یہ ہے کہ علاوہ اس دائیں ہاتھ کے زخم کے' سیدھی ران میں اور بائیں ہاتھ میں ایک ایک پھوڑا جدا ہے۔ حاجتی میں پیشاب کرتا ہوں۔ اُٹھنا دشوار ہے۔ بہر حال سوار ہوا' گیا۔ پہلے صاحب سکرتر بہادر سے ملا۔ پھر نواب صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ تصور میں کیا' بلکہ تمنا میں بھی جو بات نہ تھی' وہ حاصل ہوئی۔ یعنی عنایت سی عنایت' اخلاق سے اخلاق' وقت رخصت خلعت دیا اور فرمایا کہ یہ ہم تجھ کو اپنی طرف سے از راہ محبت دیتے ہیں اور مژدہ دیتے ہیں کہ لارڈ صاحب کے دربار میں بھی تیرا نمبر اور خلعت کھل گیا۔ انبالے جا' دربار میں شریک ہو' خلعت پہن۔ حال عرض کیا گیا۔ فرمایا۔ خیر، اور کبھی کے دربار میں شریک ہونا۔ اس پھوڑے کا بُرا ہو۔ انبالے نہ جا سکا۔ آگرے کیوں کر جاؤں؟ بابو ہر گوبند سہائے کو سلام۔

مضمون واحد　　　　۳ مئی ۱۸۶۳ء　　　　غالب

میر مہدی حسین مجروح

(٦٧)

میاں!

تم کو پنسن کی کیا جلدی ہے؟ ہر بار پنسن کو کیوں پوچھتے ہو؟ پنسن جاری ہو تو میں تم کو اطلاع نہ دوں؟ ابھی تک کچھ حکم نہیں۔ دیکھوں، کیا حکم ہو اور کب ہو؟ میرن صاحب جے پور پہنچے، تم شاہ پور ہی بتاتے ہو۔ شاید سچ یہی ہو۔ ہاں میر محمود علی اور یہ، بیر برار ابوالفضل کو تھے، مگر دیکھا چاہیے درخت جگہ سے اکھڑ کر بدشواری جمتا ہے۔ خلاصہ میری فکر کا یہ ہے کہ اب بچھڑے ہوئے یار کہیں قیامت ہی کو جمع ہوں تو ہوں۔ سو وہاں کیا خاک جمع ہوں گے۔ سنی الگ، شیعہ الگ، نیک جدا، بد جدا۔ میر سرفراز حسین کو دعا، میر نصیرالدین کو پہلے بندگی، پھر دعا۔ کتاب کا نام "دستنبو" رکھا گیا۔ آگرے میں چھاپی جاتی ہے۔ تم سے تمھارے ہاتھ کے اوراق لکھے لوں گا۔ تب ایک کتاب تم کو دوں گا۔

روز ورود نامہ۔ پنجشنبہ ۷ ستمبر ۱۸۵۸ء از غالب

(٦٨)

سید صاحب!

تمھارے خط کے آنے سے وہ خوشی ہوئی جو کسی دوست کے دیکھنے سے ہو۔ لیکن زمانہ وہ آیا ہے کہ ہماری قسمت میں خوشی ہی نہیں۔ خط سے معلوم ہوا تو کیا معلوم ہوا کہ ڈھائی سو دیے۔ ان دنوں میں ڈھائی روپے بھی بھاری ہیں۔ ڈھائی سو کیسے ہیں؟ سبحان اللہ۔ باوجود اس تہی دستی کے پھر بھی کہنا پڑتا ہے کہ روپے گئے بلا سے آبرو بچی۔ اب میر سرفراز حسین کو چاہیے کہ الور چلے جائیں۔ شاید نئے بندوبست میں کوئی صورت نوکری کی نکل آئے۔ میری دعا کہو اور یہ کہو کہ اپنا حال اور اپنا قصہ اپنے ہاتھ سے مجھ کو لکھیں۔ پنسن کا حال کچھ معلوم ہوا ہو تو کہوں۔ حاکم، خط کا جواب نہیں لکھتا۔ عملے میں ہر چند تفحص کیجیے کہ ہمارے خط پر کیا حکم ہوا، کوئی کچھ نہیں بتاتا۔ یہ ہر حال اتنا سنا ہے اور دلائل اور قرائن سے معلوم ہوا ہے کہ میں بے گناہ قرار پایا ہوں اور ڈپٹی کمشنر

بہادر کی رائے میں پنسن پانے کا استحقاق رکھتا ہوں۔ پس اس سے زیادہ نہ مجھے معلوم، نہ کسی کو خبر۔

میاں، کیا باتیں کرتے ہو؟ میں کتابیں کہاں سے چھپواتا؟ روٹی کھانے کو نہیں، شراب پینے کو نہیں۔ جاڑے آتے ہیں، لحاف توشک کی فکر ہے، کتابیں کیا چھپواؤں گا؟ منشی امید سنگھ اندور والے دلی آئے تھے۔ سابقہ معرفت مجھ سے نہ تھا۔ ایک دوست ان کو میرے گھر لے آیا۔ انھوں نے وہ نسخہ دیکھا۔ چھپوانے کا قصد کیا۔ آگرے میں میرا شاگرد رشید منشی ہرگوپال تفتہ تھا۔ اس کو میں نے لکھا۔ اُس نے اس اہتمام کو اپنے ذمہ لیا۔ مسوّدہ بھیجا گیا۔ آٹھ آنہ فی جلد قیمت ٹھہری۔ پچاس جلدیں منشی امید سنگھ نے لے لیں۔ پچیس روپے چھاپے خانے میں بطور ہنڈی بھجوا دیے۔ صاحب مطبع نے بشمول سعی منشی ہرگوپال تفتہ چھاپنا شروع کیا۔ آگرے کے حکام کو دکھایا۔ اجازت چاہی۔ حکام نے بکمال خوشی اجازت دی۔ پانسو جلد چھاپی جاتی ہے۔ اس پچاس جلد میں شاید پچیس جلد منشی امید سنگھ مجھ کو دیں گے۔ میں عزیزوں کو بانٹ دوں گا۔ پرسوں خط تفتہ کا آیا تھا، وہ لکھتے ہیں کہ ایک فرمہ چھپنا باقی رہا ہے۔ یقین ہے کہ اسی اکتوبر میں قصہ تمام ہو جائے۔

بھائی، میں نے ۱۱ مئی ۱۸۵۷ء سے اکیسویں جولائی ۱۸۵۸ء تک کا حال لکھا ہے اور خاتمہ میں اس کی اطلاع دیدی ہے۔ امین الدین خاں کو جاگیر ملنے کا حال اور بادشاہ کی روانگی کا حال کیونکر لکھتا؟ ان کو جاگیر اگست میں ملی، بادشاہ اکتوبر میں گئے۔ کیا کرتا اگر تحریر موقوف نہ کرتا؟ منشی امید سنگھ اندور جانے والے تھے۔ اگر ختم کر کے مسوّدہ اُن کے سامنے آگرہ نہ بھیج دیتا تو پھر چھپواتا کون؟ اہل خطہ کا حال از روئے تفصیل مجھ کو کیونکر معلوم ہو؟ سنتا ہوں کہ دعویٰ خون پیش کیا چاہتے ہیں۔ سودا ہو گیا۔ مسودہ ہو رہا ہے۔ بلنک صاحب کے جے پور میں ٹکڑے اُڑ گئے۔ گورنر مدعی نہ ہوئے، قصاص نہ لیا۔ اب ایک ہندوستانی کے خون کا قصاص کون لے گا؟

اے سبزۂ سر رہ از جور پا چہ خالی
در کیش روز گاراں گل خوں بہا نہ دارد

خیر جو ہونا ہے ہو رہے گا۔ بعد وقوع ہم بھی سن لیں گے۔ تم اتنا کیوں دل جلا رہے ہو؟

(اکتوبر یا نومبر ۱۸۵۸ء) (غالب)

(۶۹)

واہ واسید صاحب، تم بڑی عبارت آرائیاں کرنے لگے۔ نثر میں خودنمایاں کرنے لگے۔ کئی دن سے تمھارے خط کے جواب کی فکر میں ہوں۔ مگر جاڑے نے بےحس وحرکت کردیا ہے۔ آج جو بہ سبب ابر کے وہ سردی نہیں تو میں نے خط لکھنے کا قصد کیا ہے۔ مگر حیران ہوں کہ کیا سحر سازی کروں۔ بھائی تم اردو کے مرزا قتیل بن گئے ہو۔ اردو بازار میں نہر کے کنارے رہتے رہتے رودنیل بن گئے ہو۔ کیا قتیل، کیا رودنیل۔ یہ سب ہنسی کی باتیں ہیں۔ لوسنو اب تمھاری دتی کی باتیں ہیں۔

چوک امیں بیگم کے باغ کے دروازے کے سامنے حوض کے پاس جو کنواں تھا اس میں سنگ خشت وخاشاک ڈال کر بند کردیا۔ بلی ماروں کے دروازے کے پاس کئی دکانیں ڈھا کر راستہ چوڑا کرلیا۔ شہر کی آبادی کا حکم، خاص وعام، کچھ نہیں پنسن داروں سے حاکموں کا کام کچھ نہیں۔ تاج محل، مرزا قیصر، مرزا جواں بخت کے سالے مرزا ولایت علی بیگ جے پوری کی زوجہ ان سب کی الہ آباد سے رہائی ہوگئی ہے۔ بادشاہ، مرزا جواں بخت، مرزا عباس شاہ، زینت محل کلکتہ پہنچے اور وہاں سے جہاز پر چڑھائی ہوگی۔ دیکھئے کیپ ۲ میں رہیں یا لندن جائیں۔ خلق نے از روئے قیاس، جیسا کہ دتی کے خبرتراشوں کا دستور ہے، یہ بات اُڑادی، سو سارے شہر میں مشہور ہے کہ جنوری ۱۸۵۹ء میں لوگ عموماً شہر میں آباد کئے جائیں گے اور پنسن داروں کی جھولیاں بھر بھر کر روپے دئے جائیں گے۔ خیر آج بدھ کا دن ۲۲ دسمبر کی ہے۔ اب کے شنبہ کو بڑا دن اور اگلے شنبہ کو جنوری کا پہلا دن ہے، اگر جیتے ہیں تو دیکھ لیں گے کہ کیا ہوا۔ تم اس کا جواب لکھو اور شتاب لکھو۔

میری جان سرفراز حسین تم کیا کر رہے ہو اور کس خیال میں ہو اور آیندہ عزیمت کیا ہے؟ میر نصیر الدین کو صرف دعا اور اشتیاق دیدار۔ میرن صاحب کہاں ہے؟ کوئی جائے اور بلالائے۔ حضرت آیئے۔ سلام علیکم، مزاج مبارک، کہیے، مولوی مظہر علی نے آپ کے خط کا جواب بھیجا یا نہیں؟ اگر بھیجا تو کیا لکھا؟ مَیں جانتا ہوں کہ میر اشرف علی صاحب اور میر سرفراز علی کم اور یہ ستم پیشہ میر مہدی بہت آپ کی جناب میں گستاخیاں کرتے ہیں۔ کیا کروں؟ مَیں کہیں، تم کہیں۔

وہاں ہوتا تو دیکھتا کہ کیوں کرتم سے بے ادبیاں کرسکتے ہیں۔ انشاء اللہ تعالیٰ جب ایک جا ہوں گے، انتقام لیا جائے گا۔ ہے ہے کیوں کر ایک جا ہوں گے۔ دیکھئے زمانہ اور کیا دکھاتا ہے۔ اللہ اللہ اللہ!

بدھ ۲۲۔ دسمبر ۱۸۵۸ء غالب

(۷۰)

سید صاحب!

نہ تم مجرم، نہ میں گنہ گار۔ تم مجبور، میں ناچار۔ لو اب کہانی سنو، میری سرگزشت میری زبانی سنو۔ نواب مصطفیٰ خاں بہ میعاد سات برس کے قید ہو گئے تھے۔ سو ان کی تقصیر معاف ہوئی اور ان کو رہائی ملی، صرف رہائی کا حکم آیا ہے۔ جہانگیر آباد کی زمینداری اور دلی کی املاک اور پنسن کے باب میں ہنوز کچھ حکم نہیں ہوا۔ ناچار وہ رہا ہو کر میرٹھ ہی ہیں۔ ایک دوست کے مکان میں ٹھہرے ہیں۔ میں بہ مجرد استماع اس خبر کے ڈاک میں بیٹھ کر میرٹھ گیا۔ ان کو دیکھا، چار دن وہاں رہا۔ پھر ڈاک میں اپنے گھر آیا۔ تاریخ آنے جانے کی یاد نہیں، مگر ہفتہ کو گیا، منگل کو آیا۔ آج بدھ دوم فروری ہے۔ مجھ کو آئے ہوئے نواں دن ہے۔ انتظار میں تھا کہ تمہارا خط آئے تو اس کا جواب لکھا جائے۔ آج صبح کو تمہارا خط آیا۔ دوپہر کو میں جواب لکھتا ہوں:

روز اس شہر میں اک حکم نیا ہوتا ہے
کچھ سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ کیا ہوتا ہے

میرٹھ سے آ کر دیکھا کہ یہاں بڑی شدت ہے اور یہ حالت ہے کہ گوروں کی پاسبانی پر قناعت نہیں ہے۔ لاہوری دروازے کا تھانے دار مونڈھا بچھا کر سڑک پر بیٹھتا ہے۔ جو باہر سے گورے کی آنکھ بچا کر آتا ہے، اُس کو پکڑ کر حوالات میں بھیج دیتا ہے۔ حاکم کے ہاں سے پانچ پانچ بید لگتے ہیں یا دو روپے جرمانہ لیا جاتا ہے۔ آٹھ دن قید رہتا ہے۔ اس سے علاوہ سب تھانوں پر حکم ہے کہ دریافت کرو، کون بے ٹکٹ مقیم ہے اور کون ٹکٹ رکھتا ہے۔ تھانوں میں نقشے مرتب ہونے لگے۔ یہاں کا جمعدار میرے پاس بھی آیا۔ میں نے کہا: بھائی تو مجھے نقشے میں نہ رکھ، میری کیفیت کی عبارت الگ لکھ۔ عبارت یہ کہ اسد اللہ خاں پنسن دار ۱۸۵۰ء سے حکیم بٹیالے والے کے بھائی کی حویلی میں رہتا ہے۔ نہ کالوں کے وقت میں کہیں گیا، نہ گوروں کے زمانے میں نکالا اور نکالا

گیا۔کرنل برون صاحب بہادر کے زبانی حکم پر اس کی اقامت کا مدار ہے۔اب تک کسی حاکم نے وہ حکم نہیں بدلا۔اب حاکمِ وقت کو اختیار ہے۔پرسوں یہ عبارت جمعدار نے محلے کے نقشے کے ساتھ کوتوالی بھیج دی۔کل سے یہ حکم نکلا کہ یہ لوگ شہر سے باہر مکان دکان کیوں بناتے ہیں؟ جو مکان بن چکے ہیں انھیں ڈھا دو اور آیندہ کو ممانعت کا حکم سنا دو اور یہ بھی مشہور ہے کہ پانچ ہزار ٹکٹ چھاپے گئے ہیں۔جو مسلمان شہر میں اقامت چاہے' بقدر مقدور نذرانہ دے۔اس کا اندازہ قرار دینا حاکم کی رائے پر ہے۔روپیہ دے اور ٹکٹ لے۔گھر برباد ہو جائے' آپ شہر میں آباد ہو جائے۔آج تک یہ صورت ہے' دیکھیے شہر کے بسنے کی کون مہورت ہے؟ جو رہتے ہیں وہ بھی اخراج کیے جاتے ہیں یا باہر پڑے ہوئے ہیں وہ شہر میں آتے ہیں؟ الملک للہ والحکم للہ۔

نورچشم میر سرفراز حسین اور برخوردار میر نصیر الدین کو دعا اور جناب میرن صاحب کو سلام بھی اور دعا بھی۔اس میں سے جو وہ چاہیں قبول کریں۔

بدھ۔۲ فروری ۱۸۵۹ع غالب

(۷۱)

میری جان'

خدا تم کو ایک سو بیس برس کی عمر دے۔بوڑھا ہونے کو آیا۔داڑھی میں بال سفید آ گئے' مگر بات سمجھنی نہ آئی' پنسن کے باب میں اُلجھے ہو اور کیا بے جا اُلجھے ہو۔یہ تو جانتے ہو کہ دلی کے سب پنسن داروں کو مئی ۱۸۵۷ع سے پنسن نہیں ملا۔یہ فروری ۱۸۵۹ع بائیسواں مہینہ ہے۔چند اشخاص کو بائیس مہینے میں سال بھر کا روپیہ بطریق مدد خرچ مل گیا۔باقی چڑھے ہوئے روپے کے باب میں اور آیندہ ماہ بماہ ملنے کے واسطے ابھی کچھ حکم نہیں ہوا۔تم اب اپنے سوال کو یاد کرو کہ اس واقعہ سے اس کو کچھ نسبت ہے یا نہیں؟ یہ حضرت کا سوال امیر خسرو کی انملی ہے:

چیل بسولا لے گئی تو کاہے سے پھکوں راب؟

علی بخش خاں پچاس روپے مہینہ پاتے تھے۔بائیس مہینے کے گیارہ سو روپے ہوتے ہیں۔ان کو چھ سو روپیہ مل گیا' باقی روپیہ چڑھ رہا۔آیندہ ملنے میں کچھ کلام نہیں۔غلام حسن خاں' سو

روپیہ مہینے کا پنسن دار۔ بائیس مہینے کے بائیس سو روپے ہوتے ہیں۔اس کو بارہ سو روپے ملے۔ دیوان کشن لال کا ڈیڑھ سو روپے مہینہ' بائیس مہینے کے تین ہزار تین سو ہوتے ہیں' اس کو اٹھارہ سو روپے ملے۔ منا جمعدار دس روپیہ مہینہ کا سکہ لمبر۔ سال بھر کے ایک سو بیس لے آیا۔ اسی طرح پندرہ سولہ آدمیوں کو ملا ہے۔ آیندہ کے واسطے کچھ حکم نہیں۔ مجھ کو مدد خرچ نہیں ملا۔ جب کئی خط پر خط لکھے تو آخیر خط پر صاحب کمشنر بہادر نے حکم دیا کہ سائل کو بطریق مدد خرچ سو روپے مل جائیں۔ مَیں نے وہ سو روپے نہ لئے اور پھر صاحب کمشنر بہادر کو لکھا کہ مَیں باسٹھ روپے آٹھ آنے مہینہ پانے والا ہوں۔ سال بھر کے ساڑھے سات سو روپے ہوتے ہیں۔ سب پنسن داروں کو سال سال بھر کا روپیہ ملا' مجھ کو سو روپے کیسے ملتے ہیں؟ مثل اوروں کے مجھے بھی سال بھر کا روپیہ مل جائے۔ ابھی اس میں کچھ جواب نہیں ملا۔

آبادی کا یہ رنگ ہے کہ ڈھنڈورا پٹوا کر' ٹکٹ چھپوا کر اجرٹن صاحب بہادر بطریق ڈاک کلکتہ چلے گئے۔ دلّی کے حقا' جو باہر پڑے ہوئے ہیں' منہ کھول کر رہ گئے۔ اب وہ جب معاودت کریں گے' تب شاید آبادی ہو گی یا کوئی اور نئی صورت نکل آئے۔

میر سرفراز حسین اور میر نصیر الدین اور میرن صاحب کو دعائیں پہنچیں۔

فروری ۱۸۵۹ع غالب

(۷۲)

سیدؔ

خدا کی پناہ! عبارت لکھنے کا ڈھنگ ہاتھ کیا آیا ہے کہ تم نے سارے جہان کو سر پر اٹھایا ہے۔ ایک غریب سید مظلوم کے چہرۂ نورانی پر مہاسا نکلا ہے' تم کو سرمایۂ آرائش گفتار ہاتھ پہنچا ہے۔ میری ان کو دعا پہنچاؤ اور ان کی خیر و عافیت جلد لکھو۔

بھائی' یہاں کا نقشہ ہی کچھ اور ہے۔ سمجھ میں کسی کے نہیں آتا کہ کیا طور ہے۔ اوائل ماہ انگریزی میں روک ٹوک کی شدت ہو گئی تھی۔ آٹھویں دسویں سے وہ شدت کم ہو جاتی تھی۔ اس مہینے میں برابر وہی صورت رہی ہے۔ آج ۲۷ مارچ کی ہے۔ پانچ چار دن مہینے کے باقی ہیں۔ آنچ ویسی ہی تیز ہے۔ خدا اپنے بندوں پر رحم کرے۔

مجھ پر میرے اللہ نے ایک اور عنایت کی ہے اور اس غمزدگی میں ایک گونہ خوشی اور کیسی بڑی خوشی دی ہے۔ تم کو یاد ہوگا کہ ایک ''دستنبو'' نواب لفٹنٹ گورنر بہادر کی نذر بھیجی تھی۔ آج پانچواں دن ہے کہ نواب لفٹنٹ گورنر بہادر کا خط مقام الہ آباد سے بسبیل ڈاک آیا۔ وہی کاغذ افشانی، وہی القاب قدیم، کتاب کی تعریف، عبارت کی تحسین، مہربانی کے کلمات۔ کبھی تم کو خدا یہاں لائے گا تو اس کی زیارت کرنا۔ پنسن کے ملنے کا حکم بھی آج کل آیا چاہتا ہے اور یہ بھی توقع پڑی ہے کہ گورنر جنرل بہادر کے ہاں سے بھی کتاب کی تحسین اور عنایت کے مضامین کی تحریر آجائے۔ میرن صاحب کو سلام پہلے لکھ چکا ہوں۔ میر سرفراز حسین اور میر نصیر الدین کو دعا کہہ دینا اور خط دکھا دینا۔

۲۷مارچ ۱۸۵۹ء (غالب)

(۷۳)

مار ڈالا یار، تیری جواب طلبی نے۔ اس چرخ کج رفتار کا برا ہو۔ ہم نے اس کا کیا بگاڑا تھا؟ ملک و مال و جاہ و جلال کچھ نہیں رکھتے تھے۔ ایک گوشہ و توشہ تھا۔ چند مفلس و بے نوا ایک جگہ فراہم ہو کر ہنس بول لیتے تھے:

سو بھی نہ تو کوئی دم دیکھ سکا اے فلک
اور تو یاں کچھ نہ تھا ایک مگر دیکھنا

یاد رہے۔ یہ شعر خواجہ میر درد کا ہے۔

''کل سے مجھ کو خواجہ میکش بہت یاد آتا ہے۔'' ''سو صاحب'' اب تم ہی بتاؤ کہ میں تم کو کیا لکھوں؟ وہ صحبتیں اور تقریریں جو یاد کرتے ہو اور تو کچھ بن نہیں آتی، مجھ سے خط پر خط لکھواتے ہو۔ آنسوؤں سے پیاس نہیں بجھتی، یہ تحریر تلافی اس تقریر کی نہیں کر سکتی۔ بہر حال کچھ لکھتا ہوں۔ دیکھو، کیا لکھتا ہوں۔

سنو پنسن کی رپورٹ کا ابھی کچھ حال معلوم نہیں۔ دیر آید درست آید۔

بھئی میں تم سے بہت آزردہ ہوں۔ میرن صاحب کی تندرستی کے بیان میں نہ اظہار مسرت، نہ مجھ کو تہنیت۔ بلکہ اس طرح سے لکھا گیا ہے گویا ان کا تندرست ہونا تم کو ناگوار ہوا ہے۔

لکھتے ہو کہ میرن صاحب ویسے ہی ہو گئے‘ جیسے آگے تھے۔ اُچھلتے کودتے پھرتے ہیں۔ اس کے یہ معنی کہ ہے ہے، کیا غضب ہوا‘ یہ کیوں اچھے ہو گئے۔ یہ باتیں تمھاری ہم کو پسند نہیں آتیں۔ تم نے میر کا وہ مقطع سُنا ہوگا۔ بہ تغیر الفاظ لکھتا ہوں:

کیوں نہ میرن کو مغتنم جانوں؟ ⋅ دِلّی والوں میں اک بچا ہے یہ

میر تقی کا مقطع یہ ہے:

میر کو کیوں نہ مغتنم جانوں؟ اگلے لوگوں میں اک رہا ہے یہ

”میر“ کی جگہ ”میرن“ اور ”رہا“ کی جگہ ”بچا“ کیا اچھا تصرّف ہے!

ارے میاں‘ تم نے کچھ اور بھی سنا؟ کل یوسف مرزا کا خط لکھنؤ سے آیا۔ وہ لکھتا ہے کہ نصیر خاں عرف نواب جان‘ والد ان کا دائم الحبس ہو گیا۔ حیران ہوں کہ یہ کیسی آفت آئی۔ یوسف مرزا تو جھوٹ کاہے کو لکھے گا۔ خدا کرے اس نے جھوٹ سنا ہو۔

لو بھئی‘ اب تم چاہو بیٹھے رہو‘ چاہے جاؤ‘ اپنے گھر مَیں تو روٹی کھانے جاتا ہوں۔ اندر باہر سب روزہ دار ہیں۔ یہاں تک کہ بڑا لڑکا باقر علی خاں بھی۔ صرف ایک مَیں اور ایک میرا بیٹا حسین علی خاں‘ یہ ہم روزہ خوار ہیں۔ وہی حسین علی خاں‘ جس کا روزمرہ ہے ”کھلونے منگا دو مَیں بجار (بازار) جاؤں گا۔“

میر سرفراز حسین کو دعا کہنا اور یہ خط ان کو ضرور سنا دینا۔ برخوردار میر نصیر الدین کو دعا پہنچے۔

اپریل ۱۸۵۹ع غالب

(۷۴)

برخوردار کامگار میر مہدی‘

قطعہ تم نے دیکھا؟ سچ مچ میرا حلیہ ہے۔ واہ اب کیا شاعری رہ گئی ہے۔ جس وقت مَیں نے یہ قطعہ وہاں بھیجنے کے واسطے لکھا‘ ارادہ تھا کہ خط بھی لکھوں۔ لڑکوں نے ستایا کہ دادا جان چلو کھانا تیار ہے‘ ہمیں بھوک لگی ہے۔ تین خط اور لکھے ہوئے رکھے تھے۔ مَیں نے کہا کہ اب کیوں لکھوں۔ اسی کاغذ کو لفافے میں رکھ کر‘ ٹکٹ لگا کر‘ سرنامہ لکھ‘ کلیان کے حوالے کر‘ مَیں گھر چلا گیا اور ہاں ایک چھیڑ بھی تھی کہ دیکھوں میرا میر مہدی خفا ہو کر کیا باتیں بناتا ہے۔ سو وہی ہوا۔ تم نے جلے پھپھولے

چھوڑے۔ لو اب بتاؤ خط لکھنے بیٹھا ہوں' کیا لکھوں؟ یہاں کا حال زبانی میرن صاحب کے سن لیا ہوگا۔ مگر وہ جو تم نے سنا ہوگا' بے اصل باتیں ہیں۔ پنسن کا مقدمہ کلکتہ میں نواب گورنر جنرل بہادر کے پیش نظر' یہاں کے حاکم نے ایک روبکاری لکھ کر اپنے دفتر میں رکھ چھوڑی' میرا اس میں کیا ضرر۔ یہاں تک لکھ چکا کہ دو آدمی آ گئے۔ دن بھی تھوڑا رہ گیا۔ میں نے بکس بند کیا' باہر تختوں پر آ بیٹھا۔ شام ہوئی۔ چراغ روشن ہوا۔ منشی سید احمد حسین سرہانے کے طرف مونڈھے پر بیٹھے ہیں۔ میں پلنگ پر لیٹا ہوا ہوں کہ ناگاہ چشم و چراغ دودمان علم و یقین سید نصیر الدین آیا۔ ایک کوڑا ہاتھ میں اور ایک آدمی ساتھ' اس کے سر پر ٹوکرا' اس پر گھاس ہری بچھی ہوئی۔ میں نے کہا ہا ہا ہا! سلطان العلما مولانا سرفراز حسین دہلوی نے دوبارہ رسد بھیجی ہے۔ بارے معلوم ہوا کہ وہ نہیں ہے۔ یہ کچھ اور ہے۔ فیض خاص نہیں' لطف عام ہے۔ شراب نہیں آم ہے۔ خیر یہ مسلمیہ بھی بے خلل ہے' بلکہ نعم البدل ہے۔ ایک ایک آم کو ایک ایک سربمہر گلاس سمجھا بادۂ انگوری سے بھرا ہوا۔ مگر واہ کس حکمت سے بھرا ہے کہ پینسٹھ گلاس میں ایک قطرہ نہیں گرا ہے۔ میاں کہتا تھا کہ یہ اسّی تھے۔ پندرہ بگڑ گئے' بلکہ سڑ گئے تا کہ ان کی برائی اوروں میں سرایت نہ کرے یہ نوکرے میں سے پھینک دیے۔ میں نے کہا' بھائی' یہ کیا کم ہیں۔ اگر چہ تمھاری تکلیف اور تکلف سے خوش نہیں ہوا۔ تمھارے پاس روپیہ کہاں ہے جو تم نے آم خریدے؟ خانہ آباد' دولت زیادہ۔

لیکورایک انگریزی شراب ہوتی ہے' قوام کی بہت لطیف اور رنگت کی بہت خوب اور طعم کی ایسی میٹھی' جیسا قند کا قوام پتلا۔ دیکھو اس لغت کے معنی کسی فرہنگ میں نہ پاؤ گے' سروری میں ہو تو ہو۔

مجتہد العصر اور حکیم میر اشرف علی کو کہ وہ ان کے علم کی کنجی ہیں اور ٹکے ٹکے کی کتابیں چالیس پچاس روپے کو لے گئے ہیں' میری دعا کہہ دینا۔

۱۸۵۹ء غالب

(۷۵)

میری جان'

تم کو تو بیکاری میں خط لکھنے کا ایک شغل ہے۔ قلم دوات لے بیٹھے۔ اگر خط پہنچا ہے' تو

جواب' ورنہ شکوہ و شکایت و عتاب و خطاب لکھنے لگے۔ حکیم اشرف علی آئے تھے۔ سر منڈوا ڈالا ہے۔ ''محلقین روسکم'' پر عمل کیا ہے۔ مَیں نے کہا کہ سر منڈوایا ہے تو داڑھی رکھو۔ کہنے لگے: ''دامن از کجا آرم کہ جامہ ندارم''۔ واللہ ان کی صورت قابل دیکھنے کے ہے۔ کہتے تھے کہ امیر احمد علی صاحب آگئے اور بحال و برقرار ہے۔ خدا کا شکر بجالایا۔ کبھی تو ایسا بھی ہو کہ کسی عزیز کی اچھی خبر سنی جائے۔ میر اسلام کہنا اور مبارکباد دینا بھول نہ جائیو۔

تمھاری شکایت ہائے بیجا کا جواب یہ ہے کہ تم نے جو خط مجھ کو پانی پت سے بھیجا تھا اور کرنال کی روانگی کی اطلاع دی تھی۔ مَیں نے یہ تجویز کر لیا تھا کہ جب کرنال سے خط آئے گا تو مَیں جواب لکھوں گا۔ آج شنبہ ۱۵ اکتوبر صبح کا وقت ابھی کھانا پکا بھی نہیں۔ تبرید پی کر بیٹھا ہوں کہ تمھارا خط آیا اور پڑھا اور یہ جواب لکھا۔ کلیان بیمار ہے۔ ایاز کو خط دیکر ڈاک گھر روانہ کیا۔ بولو' تمھارا گلہ بے جا یا بجا؟ بھائی گلہ کرو تو اپنے سے کرو کہ تم نے کرنال پہنچ کر خط لکھنے میں کیوں دیر کی؟ اور ہاں یہ کیا سبب ہے کہ بہت دن سے میر نصیر الدین کا نام تمھارے قلم سے نہیں نکلتا؟ ان کی بندگی نہ لکھنے تو خیر و عافیت تو لکھتے۔ یہ باتیں اچھی نہیں۔ میرن صاحب کے باب میں حیران ہوں۔ تنہا تمھارے ساتھ گئے ہیں۔ والدہ ان کی پانی پت میں ہیں۔ وہاں کوئی مکان لے کر والدہ کو وہیں بلائیں گے یا خود بعد چندروز کے یہاں آجائیں گے؟ یہ دو باتیں جواب طلب ہیں۔ میر نصیر الدین کی بندگی نہ لکھنے کا سبب اور میرن صاحب کے بود و باش کی حقیقت لکھو۔ رہا میر احسن' اس کا ذکر نہ کرو۔ اگر ملے گا تو تم کو اطلاع دے دی جائے گی۔ شہر کی آبادی کا چرچا ہوا۔ کرائے کو مکان ملنے لگے۔ چار پانسو گھر آباد ہوئے تھے کہ پھر وہ قاعدہ مٹ گیا۔ خدا جانے کیا دستور جاری ہوا ہے۔ آئندہ کیا ہو گا۔

سلطان العلماء مجتہد العصر مولوی سید سرفراز حسین کو اگر چہ نظر ان کے مدارج علم و عمل پر' بندگی چاہیے' مگر خیر میں عزیز داری و یگانگی کی راہ سے دعا لکھتا ہوں۔ میرن صاحب کو دعا اور بعد دعا کے بہت سا پیار۔ میر نصیر الدین کو دعا۔ زیادہ کیا لکھوں۔

۱۵۔ اکتوبر ۱۸۵۹ء   از غالب

(۷۶)

بھائی!

نہ کاغذ ہے نہ ٹکٹ ہے۔ اگلے لفافوں میں سے ایک بیرنگ لفافہ پڑا ہے۔ کتاب میں سے یہ کاغذ پھاڑ کر تم کو خط لکھتا ہوں اور بیرنگ لفافہ میں لپیٹ کر بھیجتا ہوں۔ غمگین نہ ہونا۔ کل شام کو کچھ فتوح کہیں سے پہنچ گئی ہے۔ آج کاغذ اور ٹکٹ منگاؤں گا۔ شنبہ ۸ نومبر صبح کا وقت ہے' جس کو عوام بڑی فجر کہتے ہیں۔ پرسوں تمھارا خط آیا تھا' آج جی چاہا کہ ابھی تم کو خط لکھوں' اس واسطے یہ چند سطریں لکھیں۔

برخوردار میر نصیر الدین پر ان کی بیٹی کا قدم مبارک ہو۔ نام تاریخی تو مجھ سے ڈھونڈا نہ جائے گا۔ ہاں عظیم النساء بیگم اچھا ہے کہ اس میں ایک رعایت ہے شاہ محمد عظیم صاحب رحمۃ اللہ کے نام کی۔ مجتہد العصر کو میری دعا کہنا' تم کو کیا ہوا ہے کہ ان کو اپنا چھوٹا بھائی جان کر مجتہد العصر نہیں لکھا کرتے؟ یہ بے ادبی اچھی نہیں۔ میرن صاحب کو بہت بہت دعا کہنا اور میری طرف سے پیار کرنا۔

شہر کا حال کیا جانوں کیا ہے؟ ''پون ٹوٹی'' کوئی چیز ہے' وہ جاری ہوگئی ہے۔ سوائے اناج اور اُپلے کے کوئی چیز ایسی نہیں' جس پر محصول نہ لگا ہو۔ جامع مسجد کے گرد پچیس پچیس فٹ گول میدان نکلے گا۔ دکانیں حویلیاں ڈھائی جائیں گی۔ دارالبقا[۲] فنا ہو جائے گی۔ رہے نام اللہ کا۔ خان چند کا کوچہ شاہ بولا کی بڑ تک ڈھے گا۔ دونوں طرف سے پھاوڑہ چل رہا ہے۔ باقی خیرو عافیت ہے۔ حاکم اکبر کی آمد آمد رہے ہیں۔ دیکھیے دلی آئیں یا نہیں؟ آئیں تو دربار کریں یا نہیں؟ دربار کریں تو میں گنہگار بلایا جاؤں یا نہیں؟ بلایا جاؤں تو خلعت پاؤں یا نہیں؟ پنسن کا نہ کہیں ذکر ہے نہ کسی کو خبر ہے۔

سہ شنبہ ۸۔ نومبر ۱۸۵۹ء　　　　غالب

(۷۷)

میری جان!

تو کیا کہہ رہا ہے؟ بنیے سے سیانا سو دیوانہ۔ صبر و تسلیم و توکل و رضا شیوہ صوفیہ کا

ہے۔ مجھ سے زیادہ اس کو کون سمجھے گا جو تم مجھ کو سمجھاتے ہو؟ کیا میں یہ جانتا ہوں کہ ان لڑکوں کی پرورش میں کرتا ہوں؟ استغفر اللہ! لاموثر فی الوجود الا اللہ۔ یا تم یہ سمجھتے ہو کہ میں شیخ چلی کی طرح سے یہ خیال باندھتا ہوں کہ مرغی مول لوں گا اور اس کے انڈے بچے بیچ کر بکری خرید کروں گا اور پھر کیا کروں گا اور آخر کیا ہوگا؟ بھائی یہ تو میں نے اپنا راز دل تم سے کہا تھا کہ آرزو یوں ہی تھی اور اب وہ نقش باطل ہو گیا۔ ایک حسرت کا بیان تھا نہ خواہش کا۔

دیکھا اس پنسن قدیم کا حال؟ میں تو اس سے ہاتھ دھوئے بیٹھا ہوں۔ لیکن جب تک جواب نہ پاؤں کہیں اور کیونکر چلا جاؤں؟ حاکم اکبر کے آنے کی خبر گرم ہے دیکھئے کب آئے؟ آئے تو مجھے بھی دربار میں بلائے یا نہ بلائے؟ خلعت ملے یا نہ ملے؟ اس بیچ میں ایک اور بیچ آپڑا ہے۔ اس کو دیکھ لوں اور پھر اسی کی انتظار نہیں اس مرحلے کے طے ہونے کے بعد پنسن ملنے نہ ملنے کا تردد بدستور رہے گا۔ سبک سر کیوں کر بن جاؤں کہ یہ سب امور ملتوی چھوڑ کر نکل جاؤں؟ پنسن جاری ہونے پر بھی تو سوا رام پور کے ٹھکانا نہیں ہے۔ وہاں تو جاؤں اور ضرور جاؤں۔ تین برس ثبات قدم اختیار کیا۔ اب انجام کار میں اضطراب کی کیا وجہ؟ چپکے ہو رہو اور مجھ کو کسی عالم میں غمگین اور مضطر گمان نہ کرو۔ ہر وقت میں جیسا مناسب ہوتا ہے ویسا عمل میں آتا ہے۔

صاحب میرن صاحب نے دو سطریں دستخط خاص سے لکھی تھیں۔ واللہ میں کچھ نہیں سمجھا کہ یہ کس مقدمہ کا ذکر ہے۔ غالب

(۷۸)

بھائی،

کیا پوچھتے ہو؟ کیا لکھوں؟ دلی کی ہستی منحصر کئی ہنگاموں پر تھی۔ قلعہ، چاندنی چوک، ہر روز مجمع جامع مسجد کا، ہر ہفتے سیر جمنا کے پل کی، ہر سال میلہ پھول والوں کا۔ یہ پانچوں باتیں اب نہیں۔ پھر کہو دلی کہاں؟ ہاں کوئی شہر قلمرو ہند میں اس نام کا تھا۔

نواب گورنر جنرل بہادر ۱۵۔ دسمبر کو یہاں داخل ہوں گے۔ دیکھیے کہاں اترتے ہیں اور کیونکر دربار کرتے ہیں۔ آگے کے درباروں میں سات جاگیردار تھے کہ ان کا الگ الگ دربار

ہوتا تھا۔ جھجر، بہادر گڑھ، بلب گڑھ، فرخ نگر، دوجانہ، پاٹودی، لوہارو۔ چار معدوم محض ہیں۔ جو باقی رہے اس میں سے دوجانہ ولوہارو تحت حکومت ہانسی حصار، پاٹودی حاضر۔ اگر حصار کے صاحب کمشنر بہادر ان دونوں کو یہاں لے آئے تو تین رئیس، ورنہ ایک رئیس۔ دربار عام والے مہاجن لوگ سب موجود۔ اہل اسلام میں صرف تین آدمی باقی ہیں: میرٹھ میں مصطفیٰ خاں، سلطان جی میں مولوی صدرالدین خاں، بلّی ماروں میں سگ دنیا موسوم بہ اسد۔ تینوں مردود و مطرود و محروم و مغموم:

توڑ بیٹھے جب کہ ہم جام و سبو پھر ہم کو کیا
آسماں سے بادۂ گلفام گو برسا کرے

تم آتے ہو، چلے آؤ۔ نثار خاں کے چھتے کی سڑک، خان چند کے کوچہ کی سڑک دیکھ جاؤ۔ بلاقی بیگم کے کوچے کا ڈھیا، جامع مسجد کے گرد ستر ستر گز میدان نکلنا سن جاؤ۔ غالب افسردہ دل کو دیکھ جاؤ، چلے جاؤ۔

مجتہد العصر میر سرفراز حسین کو دعا، حکیم الملک اشرف علی کو دعا، قطب الملک میر نصیر الدین کو دعا۔ یوسف ہند میر افضل علی کو دعا۔

٦۔ جمادی الاولیٰ صبح جمعہ (۱۲۷٦ھ) ۲۔ دسمبر سال حال (۱۸۵۹ع) از غالب

(۷۹)

بے مے نہ کند در کف من خامہ روائی
سرد است ہوا، آتش بے دود! کجائی

میر مہدی صاحب، صبح کا وقت ہے، جاڑا خوب پڑ رہا ہے۔ انگیٹھی سامنے رکھی ہے۔ دو حرف لکھتا ہوں، ہاتھ تاپتا جاتا ہوں۔ آگ میں گرمی سہی، مگر ہائے وہ آتش سیال کہاں کہ جب دو جرعے پی لئے، فوراً رگ و پے میں دوڑ گئی، دل توانا ہوگیا، دماغ روشن ہوگیا، نفس ناطقہ کو تواجد بہم پہنچا۔ ساقی کوثر کا بندہ اور تشنہ لب! ہائے غضب! ہائے غضب!

میاں تم پنسن پنسن کر رہے ہو؟ گورنر جنرل کہاں اور پنسن کہاں؟ صاحب ڈپٹی کمشنر بہادر، صاحب کمشنر بہادر، نواب لفٹنٹ گورنر بہادر، جب ان تینوں نے جواب دیا ہو تو اس کا مرافعہ

گورنمنٹ میں کروں۔ مجھے تو دربار و خلعت کے لالے پڑے ہیں، تم کو پنسن کا فکر ہے۔ یہاں کے حاکم نے میرا نام فرد میں نہیں لکھا۔ میں نے اس کا اپیل نواب لفٹنٹ گورنر بہادر کے ہاں کیا ہے۔ دیکھیے کیا جواب آتا ہے۔ بہر حال جو کچھ ہوگا تم کو لکھا جائے گا۔

اجی وہ یوسف ہندنہ سہی، یوسف دہر سہی، یوسف عصر سہی، یوسف ہفت کشور سہی، ان کی زلیخا نے ستم برپا کر رکھا ہے۔ مجھے تو خبر نہیں، کہیں حضرت کہہ گئے کہ میں ساڑھے سات روپے مہینہ بھیجے جاؤں گا۔ اب اس کا تقاضا ہے۔ رحیم بخش روز آتا ہے اور کہتا ہے کہ پھوپھا جان کو لکھو کہ پھوپھی جان بھوکی مرتی ہیں۔ خرچ جلد بھیجو، ورنہ نالش کی جائے گی اور تم کو گواہ قرار دیا جائے گا۔ بہر حال میرن صاحب کو یہ پڑھوا دینا۔ میر سرفراز حسین کو دعا۔ حکیم میر اشرف علی کو دعا۔ یوسف ہفت کشور کو دعا۔

سہ شنبہ ۱۳ دسمبر ۱۸۵۹ء غالب

(۸۰)

میاں لڑکے!

کہاں پھر رہے ہو؟ ادھر آؤ، خبریں سنو۔ دربار لارڈ صاحب کا میرٹھ میں ہوا۔ دلی کے علاقے کے جاگیردار، بموجب حکم کمشنر دہلی میرٹھ گئے۔ موافق دستور قدیم مل آئے۔ غرضکہ پنجشنبہ ۲۹ دسمبر کو پہر دن چڑھے لارڈ صاحب یہاں پہنچے۔ کابلی دروازہ کی فصیل کے تلے ڈیرے ہوئے۔ اسی وقت توپوں کی آواز سنتے ہی میں سوار ہو کر گیا۔ میر منشی سے ملا۔ ان کے خیمہ میں بیٹھ کر صاحب سکرتر کو خبر کروائی۔ جواب آیا کہ فرصت نہیں۔ یہ جواب سن کر نومیدی کی پوٹ باندھ کر لے آیا۔ ہر چند پنسن کے باب میں ہنوز لا و نعم نہیں، مگر کچھ فکر کر رہا ہوں۔ دیکھوں کیا ہوتا ہے۔ لارڈ صاحب کل یا پرسوں جانے والے ہیں۔ یہاں کچھ کلام و پیام ممکن نہیں۔ تحریر ڈاک میں بھیجی جائے گی۔ دیکھیے کیا صورت پیش آئے گی۔

مسلمانوں کی املاک کی واگزاشت کا حکم عام ہو گیا ہے۔ جن کو کرائے پر لی ہے، ان کو کرایہ معاف ہو گیا ہے۔ آج یکشنبہ یکم جنوری ۱۸۶۰ء ہے، پہر دن چڑھا ہے کہ یہ خط تم کو لکھا ہے۔ اگر مناسب جانو تو آؤ، اپنی املاک پر قبضہ پاؤ۔ چاہو یہیں رہو، چاہو پھر چلے جاؤ۔ میر سرفراز

حسین، میر نصیرالدین، میرن کو میری دعائیں کہنا اور حکیم میر اشرف علی کو بعد دعا کے یہ کہہ دینا کہ وہ حبوب جو تم نے مجھ کو دی تھیں اُن کا نسخہ جلد لکھ کر بھیج دو۔ واللہ موجود ٗ سوا معدوم۔

یکم جنوری ۱۸۶۰ء   اپنی مرگ کا طالب' غالب

(۸۱)

اہاہاہا! میرا پیارا میر مہدی آیا۔ آؤ بھائی مزاج تو اچھا ہے؟ بیٹھو' یہ رام پور ہے' دارالسرور ہے۔ جو لطف یہاں ہے' وہ اور کہاں ہے؟ پانی سبحان اللہ! شہر سے تین سو قدم پر ایک دریا ہے اور کوسی اس کا نام ہے' بے شبہ چشمۂ آبِ حیات کی کوئی سوت اس میں ملی ہے۔ خیر! اگر یوں بھی ہے تو بھائی آبِ حیات عمر بڑھاتا ہے' لیکن اتنا شیریں کہاں ہوگا؟

خط تمھارا پہنچا۔ تردد عبث۔ میرا مکان ڈاک گھر کے قریب اور ڈاک منشی میرا دوست۔ نہ عرف لکھنے کی حاجت' نہ محلے کی حاجت' بے وسواس خط بھیج دیا کیجیے اور جواب لیا کیجیے۔ یہاں کا حال سب طرح خوب ہے اور صحبت مرغوب ہے۔ اس وقت تک مہمان ہوں' دیکھوں کیا ہوتا ہے۔ تعظیم و توقیر میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں ہے۔ لڑکے دونوں میرے ساتھ آئے ہیں۔ اس وقت اس سے زیادہ نہیں لکھ سکتا۔

فروری ۱۸۶۰ء   از غالب

(۸۲)

میر مہدی' تم میرے عادات کو بھول گئے؟ ماہِ مبارک رمضان میں کبھی مسجد جامع کی تراویح ناغہ ہوئی ہے؟ مَیں اس مہینے میں رامپور کیوں رہتا؟ نواب صاحب مانع رہے اور بہت دریغ کرتے رہے۔ برسات کے آموں کا لالچ دیتے رہے۔ مگر بھائی' مَیں ایسے انداز سے چلا کہ چاند رات کے دن یہاں آ پہنچا۔ یک شنبہ کو غرہ ماہِ مقدس ہوا۔ اسی دن سے ہر صبح کو حامد علی خاں کی مسجد میں جا کر جناب مولوی جعفر علی صاحب سے قرآن سنتا ہوں۔ شب کو مسجد جامع جا کر نماز تراویح پڑھتا ہوں۔ کبھی جو جی میں آتی ہے تو وقتِ صوم مہتاب باغ میں جا کر روزہ کھولتا ہوں اور سرد پانی پیتا ہوں۔ واہ واہ کیا اچھی طرح عمر بسر ہوتی ہے۔

اب اصل حقیقت سنو۔ لڑکوں کو ساتھ لے گیا تھا۔ وہاں انھوں نے میرا ناک میں دم کر دیا۔ تنہا بھیج دینے میں وہم آیا کہ خدا جانے اگر کوئی امر حادث ہوتا تو بدنامی عمر بھر رہے۔ اس سبب سے جلد چلا آیا ورنہ گرمی برسات وہاں کاٹتا۔ اب بشرط حیات جریدہ بعد برسات جاؤں گا اور بہت دنوں تک یہاں نہ آؤں گا۔ قرارداد یہ ہے کہ نواب صاحب جولائی ۱۸۵۹ء سے کہ جس کو یہ دسواں مہینا ہے' سو روپے مجھے ماہ بماہ بھیجتے ہیں۔ اب جو میں وہاں گیا تو سو روپیہ مہینا بنام دعوت اور دیا۔ یعنی رام پور رہوں تو دو سو روپیہ مہینہ پاؤں اور دلی رہوں تو سو روپیہ۔ بھائی سو دو سو میں کلام نہیں' کلام اس میں ہے کہ نواب صاحب دوستانہ و شاگردانہ دیتے ہیں' مجھ کو نوکر نہیں سمجھتے۔ ملاقات بھی دوستانہ رہی۔ معانقہ و تعظیم' جس طرح احباب میں رسم ہے' وہ صورت ملاقات کی ہے۔ لڑکوں سے میں نے نذر دلوائی تھی۔ بس۔ بہرحال غنیمت ہے۔ رزق کے اچھی طرح ملنے کا شکر چاہیے' کمی کا شکوہ کیا؟ انگریز کی سرکار سے دس ہزار روپے سالانہ ٹھہرے۔ ایک صاحب انے نے دیے مگر تین ہزار روپے سال' اس میں سے مجھ کو ملے ساڑھے سات سو روپے سال۔

عزت میں وہ پایہ جو رئیس زادوں کے واسطے ہوتا ہے' بنا رہا۔ ''خان صاحب بسیار مہربان دوستان'' القاب۔ خلعت سات پارچہ اور جیغہ و سرپیچ و مالائے مروارید۔ بادشاہ اپنے فرزندوں کے برابر پیار کرتے تھے۔ بخشی ناظر' حکیم کسی سے تو قیر کم نہیں' مگر فائدہ وہی قلیل۔ سومیری جان' یہاں بھی وہی نقشہ ہے۔ کوٹھری میں بیٹھا ہوں۔ ٹٹی لگی ہوئی ہے۔ ہوا آرہی ہے۔ پانی کا جھجر دھرا ہے۔ حقہ پی رہا ہوں' یہ خط لکھ رہا ہوں۔ تم سے باتیں کرنے کو جی چاہا' یہ باتیں کر لیں۔ میر سرفراز حسین اور میرن صاحب اور میر نصیرالدین صاحب کو یہ خط پڑھا دینا اور میری دعا کہہ دینا۔

جمعہ ۶۔ اپریل ۱۸۶۱ء

از غالب

(۸۳)

میاں'

کیوں ناسپاسی و ناحق شناسی کرتے ہو؟ چشم بیمار ایسی چیز ہے کہ جس کی کوئی شکایت کرے؟ تمھارا منہ چشم بیمار کے لائق کہاں؟ چشم بیمار میرن صاحب قبلہ کی آنکھ کو کہتے ہیں' جس کو

اچھے اچھے عارف دیکھتے رہتے ہیں۔ تم گنوار چشم بیمار کو کیا جانو؟ خیر بنسی ہو چکی۔ اب حقیقت حال مفصل لکھو۔ تم زحیر کی عادت رکھتے ہو عوارض چشم سے تم کو کیا علاقہ؟ میرے نور چشم کی آنکھ کیوں دکھی؟ میں نے خط تمھیں جان کر نہیں لکھا؟ تم نے لکھا تھا کہ بعد عید میں وہاں آؤں گا۔ مجھ کو خط بھیجنے میں تامل ہوا۔ لکھتے کچھ ہو کرتے کچھ ہو۔

تنخواہ کی سنو۔ دو برس کے دو ہزار دو سو پچاس ہوئے۔ سود خرچ کے جو پائے تھے، وہ کٹ گئے۔ ڈیڑھ سو متفرقات میں اٹھ گئے۔ مختار کار دو ہزار لایا۔ چونکہ میں اس کا قرض دار ہوں، روپے اس نے اپنے گھر میں رکھے اور مجھ سے کہا کہ میرا حساب کیجئے۔ حساب کیا۔ سود مول سات کم پندرہ سو روپے ہوئے۔ میں نے کہا، میرے قرض متفرق کا حساب کر۔ کچھ اوپر گیارہ سو روپے نکلے ہیں۔ میں کہتا ہوں، یہ گیارہ سو روپے بانٹ دے۔ نو سو بچے آدھے تو لے، آدھے مجھے دے۔ وہ کہتا ہے پندرہ سو مجھ کو دو، پان سات سو تم لو۔ یہ جھگڑا مٹ جائے گا تب کچھ ہاتھ آئے گا۔ خزانے سے روپیہ آ گیا ہے۔ میں نے آنکھ سے دیکھا ہو تو آنکھیں پھوٹیں۔ بات رہ گئی، پت رہ گئی۔ حاسدوں کو موت آ گئی، دوست شاد ہو گئے۔ میں جیسا ننگا بھوکا ہوں، جب تک جیوں گا، ایسا ہی رہوں گا۔ میرا دار و گیر سے بچنا کرامت اسد اللٰہی ہے۔ ان پیسوں کا ہاتھ آنا عطیہ ید اللٰہی ہے۔ حاکم شہر لکھ دے کہ یہ شخص ہرگز پنسن پانے کا مستحق نہیں، حاکم صدر مجھ کو پنسن دلوائے اور پورا دلوائے!

میرن صاحب کو دعا کہتا ہوں اور مزاج کی خبر پوچھتا ہوں۔ جواب ترکی، ترکی، جواب عربی، عربی۔ جو انھوں نے لکھا، وہ میں نے بھی لکھا۔ مجتہد العصر کو بندگی لکھوں، دعا لکھوں، کیا لکھوں؟ نہیں بھئی، وہ مجتہد ہوں، ہوا کریں، میرے تو فرزند ہیں۔ میں دعا ہی لکھوں گا اور اسی طرح میر نصیر الدین کو دعا۔

غالب

مئی ۱۸٦٠ء

(۸۴)

جان غالب،

اب کے ایسا بیمار ہو گیا تھا کہ مجھ کو خود افسوس تھا۔ پانچویں دن غذا کھائی۔ اب اچھا

ہوں، تندرست ہوں، ذی الحجہ ۱۲۷۶ھ تک کچھ کھٹکا نہیں ہے۔ محرم کی پہلی تاریخ سے اللہ مالک ہے۔ میر نصیر الدین آئے کئی بار مگر میں نے ان کو دیکھا نہیں۔ اب کی بار دورے میں مجھ کو غفلت بہت رہی۔ احباب کے آنے کی خبر نہیں ہوئی۔ جب سے اچھا ہوا ہوں، سید صاحب نہیں آئے۔ تمھاری آنکھوں کے غبار کی وجہ یہ ہے کہ جو مکان دلّی میں ڈھائے گئے اور جہاں جہاں سڑکیں نکلیں، جتنی گرد اڑی، اُس کو آپ نے ازراہِ محبت آنکھوں میں جگہ دی۔ بہر حال اچھے ہو جاؤ اور جلد آؤ۔ مجتہد العصر میر سرفراز حسین کا خط آیا تھا۔ میں نے میرن صاحب کی آزردگی کے خوف سے اس کا جواب نہیں لکھا۔ یہ رقعہ ان دونوں صاحبوں کو پڑھا دینا تا کہ میر سرفراز حسین صاحب اپنے خط کی رسید سے مطلع ہو جائیں اور میرن صاحب میرے پاس الفت پر اطلاع پائیں۔

چہار شنبہ ۶ جون ۱۸۶۰ء غالب

(۸۵)

میاں!

تمھارے خط کا جواب منحصر تین باتوں پر ہے۔ دو باتوں کا جواب لکھتا ہوں، تیسری بات کا جواب تم بتاؤ کہ تمھیں کیا لکھوں؟ پہلی بات، میاں محمد افضل تصویر لے گئے۔ اب وہ تصویر کھینچا کریں اور تم انتظار۔ دوسری بات میر نصیر الدین آئے اور تینوں صاحبوں کا جینہ کہ جانے کا حال مفصل معلوم ہوا۔ حق تعالیٰ اپنے بندوں پر رحم فرمائے۔ تیسری بات میرن صاحب کو جب تک تم کہو میں دلی نہ بلاؤں۔ گویا ان کے عاشق تمھیں ہو۔ میں نہیں۔ بھائی، ہوش میں آؤ، غور کرو۔ یہ مقدور مجھ میں نہیں کہ ان کو یہاں بلا کر ایک الگ مکان رہنے کو دوں اور اگر زیادہ نہ ہو تو تیس روپے مہینہ مقرر کروں کہ بھائی یہ لو اور دریبہ اور چاوڑی اور اجمیری دروازے کا بازار اور بلاقی بیگم کا کوچہ اور خان دوران حاں کی حویلی کے کھنڈر گنتے پھرو۔ اے میر مہدی، تو درماندہ و عاجز پانی پت میں پڑا رہے، میرن صاحب وہاں پڑے ہوئے دلی دیکھنے کو ترسا کریں۔ سرفراز حسین نوکری ڈھونڈتا پھرے اور میں ان غمہائے جاں گداز کی تاب لاؤں؟ مقدور ہوتا تو دکھا دیتا کہ میں نے کیا کیا، اے بسا آرزو کہ خاک شدہ۔ اللہ اللہ۔ سہ شنبہ ۴۔ جمادی الثانی (۱۲۷۷ھ)

۱۸ دسمبر ۔ ۱۸۶۰ء غالب

(۸۶)

جانِ غالب!

تمھارا خط پہنچا۔ غزل اصلاح کے بعد پہنچتی ہے:

ہر اک سے پوچھتا ہوں وہ کہاں ہے

مصرع بدل دینے سے یہ شعر کس رتبہ کا ہو گیا۔

اے میر مہدی تجھے شرم نہیں آتی:

میاں یہ اہلِ دلّی کی زباں ہے

ارے اب اہلِ دہلی ہندو ہیں یا اہلِ حرفہ ہیں یا خاکی ہیں یا پنجابی ہیں یا گورے ہیں۔ ان میں سے تو کس کی زبان کی تعریف کرتا ہے؟ لکھنؤ کی آبادی میں کچھ فرق نہیں آیا۔ ریاست تو جاتی رہی، باقی ہر فن کے کامل لوگ موجود ہیں۔ خس کی ٹٹی پروا ہوا اب کہاں؟ وہ لطف تو اُسی مکان میں تھا۔ اب میر خیراتی کی حویلی میں وہ چھت اور سمت بدلی ہوئی ہے۔ بہ ہر حال می گزرد۔ مصیبت عظیم یہ ہے کہ قاری کا کنواں بند ہو گیا۔ لال ڈگی کے کنوئیں یک قلم کھاری ہو گئے۔ خیر کھاری ہی پانی پیتے، گرم پانی نکلتا ہے۔ پرسوں میں سوار ہو کر کنوؤں کا حال دریافت کرنے گیا تھا۔ جامع مسجد ہوتا ہوا راج گھاٹ کے دروازے کو چلا۔ مسجد جامع سے، اج گھاٹ کے دروازے تک، بے مبالغہ ایک صحرا لق و دق ہے۔ اینٹوں کے ڈھیر جو پڑے ہیں، وہ اگر اٹھ جائیں تو ہُو کا مکان ہو جائے۔ یاد کرو، مرزا گوہر کے باغیچے کے اس جانب کو کئی بانس نشیب تھا، وہ اب باغیچے کے صحن کے برابر ہو گیا۔ یہاں تک کہ راج گھاٹ کا دروازہ بند ہو گیا۔ فصیل کے کنگورے کھلے رہے ہیں، باقی سب اَٹ گیا۔ کشمیری دروازہ کا حال تم دیکھ گئے ہو۔ اب آہنی سڑک کے واسطے کلکتہ دروازے سے کابلی دروازے تک میدان ہو گیا۔ پنجابی کٹرا، دھوبی واڑہ، رام جی گنج، سعادت خاں کا کٹرا، جرنیل کی بی بی کی حویلی، رام جی داس گودام والے کے مکانات، صاحب رام کا باغ، حویلی، ان میں سے کسی کا پتہ نہیں ملتا۔ قصہ مختصر شہر صحرا ہو گیا تھا۔ اب جو کنوئیں جاتے رہے اور پانی گوہر نایاب ہو گیا تو یہ صحرا صحرائے کربلا ہو جائے گا۔ اللہ اللہ۔ دلّی والے اب تک یہاں کی زبان کو اچھا کہے جاتے ہیں۔ واہ رے حسنِ اعتقاد۔ ارے بندۂ خدا، اردو بازار نہ رہا، اردو کہاں؟ دلّی واللہ اب

شہر نہیں ہے' کمپ ہے' چھاؤنی ہے' نہ قلعہ' نہ شہر' نہ بازار' نہ نہر۔
الور کا حال کچھ اور ہے۔ مجھے اور انقلاب سے کیا کام؟ الگزنڈر ہیڈر لے کا کوئی خط نہیں آیا۔ ظاہراً ان کی مصاحبت نہیں' ورنہ مجھ کو ضرور خط لکھتا رہتا۔ میر سرفراز حسین اور میرن صاحب اور نصیر الدین کو دعا۔

۱۸۶۰ء غالب

(۸۷)

او میاں سید زادہ' آزادہ' دلّی کے عاشق دلدادہ' ڈھے ہوئے اردو بازار کے رہنے والے' حسد سے لکھنو کو بُرا کہنے والے' نہ دل میں مہر و آزرم' نہ آنکھ میں حیا و شرم۔ نظام الدین ممنون کہاں! ذوق کہاں! مومن خاں کہاں! ایک آزردہ سو خاموش' دوسرا غالب' وہ بیخود و مدہوش۔ نہ سخنوری رہی' نہ سخندانی' کس برتے پر تتا پانی؟ ہائے دلّی! وائے دلّی! بھاڑ میں جائے دلّی۔
سنو صاحب' پانی پت کے رئیسوں میں ایک شخص ہیں احمد حسین خاں ولد دلاور خاں ولد سردار خاں اور نانا اس احمد حسین خاں کے غلام حسین خاں ولد صاحب خاں۔ اس شخص کا حال از روئے تحقیق مشرح و مفصل لکھو۔ قوم کیا ہے؟ معاش کیا ہے؟ طریق کیا ہے؟ احمد حسین خاں کی لیاقت ذاتی کا کیا رنگ ہے؟ طبیعت کا کیا ڈھنگ ہے؟ بھائی خوب چھان کر لکھو اور جلد لکھو۔

پنجشنبہ ۲۳ مئی ۱۸۶۱ء غالب

(۸۸)

"اے جناب میرن صاحب' السلام علیکم!"
"حضرت آداب!"
"کہو صاحب' آج اجازت ہے' میر مہدی کے خط کا جواب لکھنے کی؟"
"حضور' میں کیا منع کرتا ہوں؟ میں نے عرض کیا تھا کہ اب وہ تندرست ہو گئے ہیں۔ بخار جاتا رہا ہے' صرف پیچش باقی ہے۔ وہ بھی رفع ہو جائے گی۔ میں اپنے ہر خط میں آپ کی طرف سے دعا لکھ دیتا ہوں۔ آپ پھر کیوں تکلیف کریں؟"
"نہیں' میرن صاحب! اس کے خط کو آئے ہوئے' بہت دن ہوئے ہیں۔ وہ خفا ہوا ہو

گا۔ جواب لکھنا ضرور ہے۔"

"حضرت، وہ آپ کے فرزند ہیں، آپ سے خفا کیا ہوں گے۔"

"بھائی، آخر کوئی وجہ تو بتاؤ کہ تم مجھے خط لکھنے سے کیوں باز رکھتے ہو؟"

"سبحان اللہ، اے لو حضرت، آپ تو خط نہیں لکھتے اور مجھے فرماتے ہیں کہ تو باز رکھتا ہے۔"

"اچھا، تم باز نہیں رکھتے، مگر یہ تو کہو کہ تم کیوں نہیں چاہتے کہ مَیں میر مہدی کو خط لکھوں؟"

"کیا عرض کروں، سچ تو یہ ہے کہ جب آپ کا خط جاتا اور وہ پڑھا جاتا تو مَیں سنتا اور حظ اٹھاتا۔ اب جو میں وہاں نہیں ہوں تو نہیں چاہتا کہ تمھارا خط جاوے۔ مَیں پنجشنبہ کو روانہ ہوتا ہوں۔ میری روانگی کے تین دن بعد آپ خط شوق سے لکھیے گا۔"

"میاں، بیٹھو، ہوش کی خبر لو۔ تمھارے جانے نہ جانے سے مجھے کیا علاقہ؟ مَیں بوڑھا آدمی، بھولا آدمی، تمھاری باتوں میں آ گیا اور آج تک اسے خط نہیں لکھا۔ لاحول ولا قوۃ۔"

سنو، میر مہدی صاحب، میرا کچھ گناہ نہیں۔ میرے خط کا جواب لکھو۔ تپ تو رفع ہو گئی، پیچش رفع ہونے کی خبر شتاب لکھو۔ پرہیز کا بھی خیال رکھا کرو۔ یہ بڑی بات ہے کہ وہاں کچھ کھانے کو ملتا ہی نہیں۔ تمھارا پرہیز اگر ہو گا بھی تو عصمت بی بی از بے چادری ہو گا۔

حالات یہاں کے مفصّل میرن صاحب کی زبانی معلوم ہوں گے۔ دیکھو، بیٹھے ہیں۔ کیا جانوں۔ حکیم میر اشرف علی میں اور ان میں کچھ کونسل تو ہو رہی ہے۔ پنجشنبہ روانگی کا دن ٹھہرا تو ہے۔ اگر چل نکلیں اور پہنچ جائیں تو ان سے یہ پوچھو کہ جناب ملکۂ انگلستان کی سالگرہ کی روشنی کی محفل میں تمھاری کیا گت ہوئی تھی اور یہ بھی معلوم کر لی جیو کہ جو فارسی مثل مشہور ہے کہ "دفتر را گاؤ خورد" اس کے معنی کیا ہیں؟ پوچھیو اور نہ چھوڑیو جب تک یہ نہ بتائیں۔

اس وقت پہلے تو آندھی چلی، پھر مینہ آیا۔ اب مینہ برس رہا ہے۔ مَیں خط لکھ چکا ہوں۔ سرنامہ لکھ کر چھوڑوں گا۔ جب ترشح موقوف ہو جائے گا تو کلیان ڈاک کو لے جائے گا۔ میر سرفراز حسین کو دعا پہنچے۔ اللہ اللہ! تم پانی پت کے سلطان العلماء اور مجتہد العصر بن گئے۔ کہو وہاں کے

لوگ تمھیں قبلہ وکعبہ کہنے لگے یا نہیں؟ میر نصیر الدین کو دعا کہنا۔

مئی ۱۸۶۱ء غالب

(۸۹)

برخوردار،

تمھارا خط آیا، حال معلوم ہوا۔ میں اس خیال میں تھا کہ الور کا کچھ حال معلوم کرلوں اور کپتان الگزنڈر کا خط آئے اور میں اس کو میر سرفراز حسین کے مقدمے میں لکھوں، تو اس وقت تمھارے خط کا جواب لکھوں۔ چونکہ آج تک ان کا خط نہ آیا، میں سوچا اگر اسی انتظار میں رہوں گا اور خط کا جواب نہ بھیجوں گا تو میرا پیارا مہدی خفا ہوگا۔ ناچار جو کچھ الور کا حال سنا ہے وہ اور کچھ اپنا حال لکھتا ہوں۔

ہر چند میں نے دریافت کرنا چاہا، حکیم محمود علی کا وہاں پہنچنا اور یہ کہ وہاں پہنچنے کے بعد کیا طور قرار پایا، کچھ معلوم نہیں ہوا۔ صرف خبر واحد ہے کہ ان کو راؤ راجا نے صاحب ایجنٹ سے اجازت لے کر بلا لیا ہے۔ کہتے ہیں کہ صاحب ایجنٹ الور نے راجہ کے بالغ اور عاقل ہونے کی رپورٹ صدر کو بھیجی ہے۔ کیا عجب ہے کہ اُن کا راج اُن کو مل جائے۔

مولانا غالب علیہ الرحمۃ ان دنوں میں بہت خوش ہیں۔ پچاس ساٹھ جزو کی کتاب امیر حمزہ کی داستان کی اور اسی قدر حجم کی ایک جلد بوستان خیال کی آ گئی۔ سترہ بوتلیں بادۂ ناب کی توشک خانہ میں موجود ہیں، دن بھر کتاب دیکھا کرتے ہیں، رات بھر شراب پیا کرتے ہیں:

کسے کیں مرادش میسر بود
اگر جم نہ باشد سکندر بود

میر سرفراز حسین کو اور میرن صاحب کو اور میر نصیر الدین کو دعائیں اور دیدار کی آرزوئیں۔ (غالب)

(۹۰)

میاں،

کس حال میں ہو؟ کس خیال میں ہو؟ کل شام کو میرن صاحب روانہ ہوئے۔ یہاں

اُن کی سسرال میں قصے کیا کیا نہ ہوئے۔ ساس اور سالیوں نے اور بی بی نے آنسوؤں کے دریا بہا دیے۔ خوشدامن صاحبہ بلائیں لیتی تھیں۔ سالیاں کھڑی ہوئی دعائیں دیتی تھیں۔ بی بی مانند صورت دیوار چپ' جی چاہتا تھا چیخنے کو مگر ناچار چپ' وہ تو غنیمت تھا کہ شہر ویران' نہ کوئی جان نہ پہچان' ورنہ ہمسائے میں قیامت برپا ہو جاتی۔ ہر ایک نیک بخت اپنے گھر سے دوڑی آتی۔ امام ضامن علیہ السلام کا روپیہ بازو پر باندھا۔ گیارہ روپے خرچ راہ دیے۔ مگر ایسا جانتا ہوں کہ میرن صاحب اپنی جد کی نیاز کا روپیہ راہ ہی میں اپنے بازو پر سے کھول لیں گے اور تم سے صرف پانچ روپے ظاہر کریں گے۔ اب سچ جھوٹ تم پر کھل جائے گا۔ دیکھنا کہ یہی ہوگا کہ میرن صاحب بات تم سے چھپائیں گے۔ اس سے بڑھ کر ایک بات اور ہے اور وہ محل غور ہے، ساس غریب نے بہت سی جلیبیاں اور تودہ قلاقند ساتھ کر دیا ہے اور میرن صاحب نے اپنے جی میں یہ ارادہ کیا ہے کہ جلیبیاں راہ میں چٹ کریں گے اور قلاقند تمھاری نذر کر کر تم پر احسان دھریں گے۔ ''بھائی میں دلی سے آیا ہوں اور قلاقند تمھارے واسطے لایا ہوں۔'' زنہار باور نہ کیجیو مال مفت سمجھ کر لے لیجو۔ کون گیا ہے؟ کون لایا ہے؟ کلو' ایاز کے سر پر قرآن رکھو' کلیان کے ہاتھ میں گنگا جلی دو' بلکہ میں بھی قسم کھاتا ہوں کہ ان تینوں میں سے کوئی نہیں لایا۔ واللہ میرن صاحب نے کسی سے نہیں منگایا' اور ستو' مولوی مظہر علی صاحب لاہوری دروازہ کے باہر صدر بازار تک ان کو پہنچا گئے۔ رسم مشایعت عمل میں آئی۔ اب کہو بھائی کون بُرا اور کون اچھا ہے؟ میرن صاحب کی نازک مزاجیوں نے کھیل بگاڑ رکھا ہے۔ یہ لوگ تو ان پر اپنی جان نثار کرتے ہیں' عورتیں صدقہ جاتی ہیں۔ مرد پیار کرتے ہیں۔

مجتہد العصر سلطان العلماء مولوی سرفراز حسین کو میری دعا کہنا اور کہنا کہ حضرت ہم تم کو دعا کہیں اور تم ہم کو دعا دو۔ میاں' کس قصے میں پھنسا ہے؟ فقہ پڑھ کر کیا کرے گا؟ طب و نجوم و ہیئت و منطق و فلسفہ پڑھ' جو آدمی بنا چاہے' خدا کے بعد نبیؐ اور نبیؐ کے بعد امام' یہی ہے مذہب حق والسلام والاکرام' علی علی کیا کر فارغ البال رہا کر۔

مئی ۱۸۶۱ء

غالب

(۹۱)

سیّد صاحب'

اچھا ڈھکوسلا نکالا ہے کہ بعد القاب کے شکوہ شروع کر دینا اور میرن صاحب کو اپنا ہم زبان کر لینا۔ مَیں میر مہدی نہیں کہ میرن صاحب پر مرتا ہوں۔ میر سرفراز حسین نہیں کہ ان کو پیار کرتا ہوں۔ علی کا غلام اور سادات کا معتقد ہوں۔ اس میں تم بھی آ گئے۔ کمال یہ کہ میرن صاحب سے محبت قدیم ہے۔ دوست ہوں۔ عاشق زار نہیں۔ بندۂ مہر و وفا ہوں' گرفتار نہیں۔ تمھارے بھائی نے سخت مشوش بلکہ نعل در آتش کر رکھا ہے۔ ایک سلام اصلاح کے واسطے بھیجا اور لکھا کہ بعد محرم کے مَیں بھی آ ؤں گا۔ مَیں نے سلام رہنے دیا اور منتظر رہا کہ ڈاک میں کیوں بھیجوں' وہ آئیں گے تو یہیں اُن کو دوں گا۔ محرم تمام ہوا' آج سہ شنبہ غرّہ صفر ہے۔ حضرت کا پتا نہیں۔ ظاہراً برسات نے نہ آنے دیا۔

برسات کا نام آ گیا۔ سو پہلے مجملاً سنو: ایک غدر کالوں کا' ایک ہنگامہ گوروں کا' ایک فتنہ انہدام مکانات کا' ایک آفت وبا کی' ایک مصیبت کال کی' اب یہ برسات جمیع حالات کی جامع ہے۔ آج اکیسواں دن ہے۔ آفتاب اس طرح نظر آ جاتا ہے' جس طرح بجلی چمک جاتی ہے۔ رات کو کبھی کبھی اگر تارے دکھائی دیتے ہیں تو لوگ ان کو جگنو سمجھ لیتے ہیں۔ اندھیری راتوں میں چوروں کی بن آئی۔ کوئی دن نہیں کہ دو چار گھر کی چوری کا حال نہ سنا جائے۔ مبالغہ نہ سمجھنا۔ ہزار ہا مکان گر گئے۔ سیکڑوں آدمی جا بجا دب کر مر گئے۔ گلی گلی ندی بہہ رہی ہے۔ قصہ مختصر' وہ اَن کال تھا کہ مینہ نہ برسا' اناج نہ پیدا ہوا۔ یہ پَن کال ہے۔ پانی ایسا برسا کہ بوئے ہوئے دانے بہہ گئے۔ جنھوں نے ابھی نہیں بویا تھا' وہ بونے سے رہ گئے۔ سُن لیا دلّی کا حال؟ اس کے سوا کوئی نئی بات نہیں۔ جناب میرن کو دعا۔ زیادہ کیا لکھوں؟

سہ شنبہ یکم صفر ۱۲۷۹ھ۔ ۲۹ جولائی ۱۸٦۲ء — غالب

خواجہ غلام غوث خاں بے خبر

(۹۲)

قبلہ!

اس نامہ مختصر نے وہ کیا جو پارۂ ابر کشت خشک سے کرے یعنی خط اور پارسل کا پہنچ جانا ایسا نہیں کہ اس کی خبر پا کر بخت کی رسائی کا سپاس گزار نہ ہوں۔ یہ تو حضرت کو لکھ چکا ہوں کہ دوسرا پارسل اور خط ایک ساتھ بھیجا گیا ہے اور ہر گونہ توقع کا خیال اسی پارسل پر ہے' کس واسطے کہ اس خط میں حاکم اعظم کے نام کی عرضی ملفوف ہے۔ جانتا ہوں کہ محکمہ ایک' ڈاک ایک' دونوں لفافے ایک دن پہنچے ہوں گے' مگر دل نہیں مانتا اور کہتا ہے کہ نہ مانوں گا' جب تک کہ حضرت اس سر رشتے سے معلوم کر کے نہ لکھیں گے۔ اب آپ جانیے اور یہ دل سوداز دہ۔ میں اس کی سفارش کرنے والا اور اس کے مدعا کا گزارش کرنے والا کون؟ ہاں اتنی بات ہے کہ آپ لکھ سکتے ہیں بلکہ یہ بھی آپ مجھ پر حالی کر سکتے ہیں کہ نذر ولایت کی' ولایت کو روانہ ہوئی یا نہیں؟ میری جگر کاوی کی قدر دانی ہوئی یا نہیں؟ پیشگاہ سے موافق دستور کے خط کا امیدوار ہوں یا نہیں؟ اپنے حسن طبع کا شکر گزار ہوں یا نہیں؟ اس خط کا جواب جتنا جلد عنایت کیجیے گا' مجھ کو جلا لیجیے گا۔ لوہارو کا خط ایک معتمد کے ہاتھ بھیج دیا گیا۔

(دسمبر ۱۸۵۸ ح) (غالب)

(۹۳)

جناب عالی

آج دوشنبہ ۳ جنوری ۱۸۵۹ء کی ہے۔ پہر دن چڑھا ہو گا کہ ابر گھر رہا ہے' ترشح ہو رہا ہے' ہوا سرد چل رہی ہے' پینے کو کچھ! میسر نہیں' نا چار روٹی کھائی ہے:

افق ہا پُر از ابر بہمن مہی   سفالینہ جام من از مے تہی

غمزدہ و دردمند بیٹھا تھا کہ ڈاک کا ہر کارہ تمھارا خط لایا۔ سرنامے کو دیکھ کر اس راہ سے (کہ) دستخط خاص کا لکھا ہوا ہے' بہت خوش ہوا۔ خط کو پڑھ کر اس رُو سے کہ حصول مدعا کے ذکر پر

حادی نہ تھا افسردگی حاصل ہوئی۔

ما خانہ رمیدگان ظلمیم پیغام خوش از دیار ما نیست

اس افسردگی میں جی چاہا کہ حضرت سے باتیں کرو۔ باآنکہ خط جواب طلب نہ تھا' جواب لکھنے لگا۔

پہلے تو یہ سنیے کہ آپ کے دوست کو آپ کا خط پہنچ گیا' مگر وہ دوبارہ مجھ کو لکھ چکا ہے کہ مَیں جواب اس کا نشان مرقومہ لفافہ کے مطابق ڈاک میں بھیج چکا ہوں۔ جواب الجواب کا منتظر ہوں۔

آپ جانتے ہیں کہ کمال یاس مقتضی استغنا ہے' پس اب اس سے زیادہ یاس کیا ہوگی کہ بامید مرگ جیتا ہوں۔ اس راہ سے کچھ مستغنی ہوتا چلا ہوں کہ دوڈھائی برس کی زندگی اور ہے' ہر طرح گزر جائے گی۔ جانتا ہوں کہ تم کہو گے کہ تم کو نسی آئے گی کہ یہ کیا بکتا ہے؟ مرنے کا زمانہ کون بتا سکتا ہے؟ چاہے الہام سمجھیے' چاہے اوہام سمجھیے' بیس برس سے یہ قطعہ لکھ رکھا ہے:

من کہ باشم کہ جاوداں باشم چوں نظیری نماند و طالب مرد

در بگویند در کدا ی سال مرد غالب؟ بگو کہ "غالب مرد"

اب بارہ سو چہتر ہیں اور "غالب مرد" بارہ سو ستتر ہیں۔ اس عرصے میں جو کچھ مسرت پہنچنی ہو پہنچ لے' ورنہ پھر ہم کہاں!

۳ جنوری ۱۸۵۹ء (غالب)

(۹۴)

بندۂ گنہگار شرمسار عرض کرتا ہے کہ پرسوں غازی آباد کا اٹھا ہوا گیارہ بجے اپنے گھر پر مثل بلائے ناگہانی نازل ہوا ہوں:

باید کہ کنم ہزار نفریں بر خویش

اما بہ زبان جادۂ راہ وطن

خواجہ صاحب کی رحلت کا اندوہ' بقدر قرب و قرابت آپ کو اور باندازۂ مہر و محبت مجھ کو۔ وہ مغفور میرا قدردان اور مجھ پر مہربان تھا۔ حق تعالیٰ اس کو اعلیٰ علیین میں بسبیل دوام قیام

دے۔رام پور ہی میں تھا کہ "اودھ اخبار" میں حضرت کی غزل نظر افروز ہوئی۔کیا کہنا ہے! ابداع اس کو کہتے ہیں۔جدت طرز اس کا نام ہے۔جو ڈھنگ تازہ نوایانِ ایران کے خیال میں نہ گزرا تھا، وہ تم بروئے کار لائے۔خدا تم کو سلامت رکھے اور میرے دکھنی صاحب "برہان قاطع" کے جھگڑے میں بخلاف اور فارسی دانوں کے توفیق انصاف عطا کرے۔لو اب اس کا جواب جلد بھیجو تا یہ طریقہ مسلسل ہو جائے۔

۱۰ جنوری ۱۸۶۶ء (غالب)

(۹۵)

مولانا بندگی!

آج صبح کے وقت شوقِ دیدار میں بے اختیار نہ ریل نہ ڈاک، توسنِ ہمت پر سوار چل دیا ہوں۔جانتا ہوں کہ تم تک پہنچ جاؤں گا مگر یہ نہیں جانتا کہ کہاں پہنچوں گا۔اتنا بے خود ہوں کہ جب تک تم جواب نہ دوگے میں نہ جانوں گا کہ کہاں پہنچا اور کب پہنچا۔

آپ کا پہلا خط رام پور سے دلی آیا۔میں راہ میں تھا۔پھر دلی سے خط رام پور پہنچا۔میں وہاں بھی نہ تھا۔خط دلی روانہ ہوا۔اب کئی دن ہوئے کہ میں نے ڈاک سے پایا،اس حال میں کہ میں بیمار تھا۔معہذا جاڑے کی شدت، مہاوٹ کا مہینہ، دھوپ کا پتہ نہیں، پردے چھٹے ہوئے، نشیمن تاریک۔آج نیرِ اعظم کی صورت نظر آئی۔دھوپ میں بیٹھا ہوں۔خط لکھ رہا ہوں۔حیران ہوں کہ کیا لکھوں؟اس خط کے مضامین اندوہ فزا نے دل کو مضمحل کر دیا۔جانتا تھا کہ خواجہ صاحب مغفور تمھارے ماموں ہیں۔مگر ان کے اور تمھارے معاملات مہر وولا جیسے کہ تمھاری تحریر سے اب معلوم ہوئے میرے دل نشین نہ تھے۔ایسے محب کا فراق اور پھر بقیدِ دوام کیوں کر جانگزا نہ ہو۔حق تعالیٰ ان کو بخشے اور تم کو صبر دے۔

حضرت میں بھی اب چراغِ سحری ہوں۔رجب ۱۲۸۲ھ حال کی آٹھویں تاریخ سے اکہتر واں سال شروع ہو گیا۔طاقت سلب، حواس مفقود، امراض مستولی۔بقول نظامی:

یکے مرد شخصم بمردی رواں

آج میں اور بھی باتیں کرتا مگر میرا خاص تراش آ گیا۔ مہینے بھر سے حجامت نہیں بنوائی۔ خط لپیٹ کر ڈاک میں بھیجتا ہوں اور خط بنواتا ہوں۔

(۱۸۶۶ع) (غالب)

انورالدولہ نواب سعداللہ خاں شفق

(۹۶)

پیرومرشد

کیا حکم ہوتا ہے؟ احمق بن کر چپ ہو رہوں یا جواز روئے کشف یقینی مجھ پر حالی ہوا ہے وہ کہوں؟ اوّل رجب میں آپ نے نوازش نامہ کب بھیجا؟ آخر میرے پاس پہنچ ہی گیا' یہ جو اب بھیجا۔ اگر روانہ ہوا ہوتا تو وہ بھی پہنچ گیا ہوتا۔ بہر حال محبت کی گرمی ہنگامہ ہے' یہ جملہ محض آرایش عنوان نامہ ہے:

عمرت دراز باد کہ ایں ہم غنیمت است

پنسن داروں کا اجراء پنسن اور اہلِ شہر کی آبادی مسکن' یہاں اس صورت پر نہیں ہے جیسی اور کہیں ہے۔ اور جگہ سیاست ہے کہ منجملہ ضروریات ریاست ہے' یہاں قہرالٰہی ہے کہ منشاء تباہی ہے۔ خاص میرے پنسن کے باب میں گورنمنٹ سے رپورٹ طلب ہوئی ہے۔ ابناء روزگار حیران ہیں کہ یہ بھی ایک بات عجب ہوئی ہے۔ رپورٹ کی روانگی کی دیر ہے' چند روز اور بھی قسمت کا پھیر ہے۔ دلّی علاقہ لفٹنٹ گورنر سے انقطاع پا گئی اور احاطۂ پنجاب کے تحت حکومت آ گئی۔ رپورٹ یہاں سے لاہور اور لاہور سے کلکتہ جائے گی اور اسی طرح پھیر کھا کر نوید حکم منظوری آئے گی۔

فعل لازم کو جب متعدی کیا چاہیے تو پہلے مضارع میں سے مصدر بنا لینا چاہیے۔ ''گشتن'' مصدر اصلی' ''گردد'' مضارع' ''گردیدن'' مصدر مضارعی' ''گرداندن'' و ''گردانیدن'' مصدر متعدی۔ موافق اس قاعدے کے ''کردن'' کا متعدی ''کناندن'' و ''کنا

نیدن'' نہ کہ ''کراندن''۔ ''کراندن'' تو کرانے کی فارسی ہے۔ جیسے چلنے کی فارسی ''چلیدن'' ہے اور یہ شوخی طبع وظرافت ہے، نہ اس میں صحت ہے، نہ لطافت ہے۔ ''کراندن'' غلط اور ''کنانیدن'' صحیح۔ ''گشتن'' کو ''گشتاندن'' اور ''رستن'' کو ''رستاندن'' نہ کہیں گے، بلکہ ''گردیدن'' ''رویدن'' بنا کر ''گرداندن'' ''رویاندن'' لکھیں گے۔ بلغا کے کلام میں کردن کا متعدی شاید کہیں نہ آیا ہو، اگر آیا ہو گا تو کنانیدن آیا ہو گا۔ ''کراندن'' ٹکسال باہر ہے۔

تذکیر و تانیث کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ ''دہی'': بعض کہتے ہیں ''دہی اچھا''، بعض کہتے ہیں ''دہی اچھی''۔ ''قلم'': کوئی کہتا ہے: ''قلم ٹوٹ گیا''، کوئی کہتا ہے: ''قلم ٹوٹ گئی''۔ فقیر ''دہی'' کو مذکر بولتا ہے اور ''قلم'' کو بھی مذکر جانتا ہے۔ علیٰ ہذا القیاس۔

شنگرف بھی مذبذب ہے۔ کوئی مذکر اور کوئی مونث کہتا ہے۔ مَیں تو شنگرف کو مونث کہوں گا۔ خلاصہ یہ کہ اس ہیچ مداں کے نزدیک ''کردن'' کا متعدی ''کنانیدن'' ہے اور ''شنگرف'' موئنث۔

خداوند! آئین بندہ پروری بھول نہ جاؤ۔ گاہ گاہ نامہ و پیام بھیجتے رہو۔ کیا مَیں کہہ نہیں سکتا کہ مَیں نے اس عرصے میں دو خط بھیجے اور آپ نے ایک خط کا جواب نہیں لکھا؟ ہاں یہ عرض کرتا ہوں، آج صبح کو آپکا خط آیا، اِدھر پڑھا اور اُدھر جواب لکھا۔ سچ یوں ہے کہ ڈاک میں اکثر خطوط تلف ہو جاتے ہیں۔ بیرنگ پر ضائع ہونے کا گمان کم ہے۔ اس دستور کا بادی اور بانی مَیں ہوتا ہوں۔ یہ خط بیرنگ بھیجتا ہوں۔ آپ بھی اب جب کبھی بفرض محال خط بھیجیے تو بیرنگ بھیجیے۔ زیادہ حد ادب۔

نگاشتہ چہار شنبہ، سوم شعبان (۱۲۷۵ھ) و نہم مارچ سال حال (۱۸۵۹ع) (غالب)

(۹۷)

پیر و مرشد! بارہ بجے تھے، مَیں ننگا اپنے پلنگ پر لیٹا ہوا حقہ پی رہا تھا کہ آدمی نے آ کر خط دیا۔ مَیں نے کھولا، پڑھا۔ بھلے کو انگرکھا یا کرتا گلے میں نہ تھا۔ اگر ہوتا تو مَیں گریبان پھاڑ ڈالتا۔ حضرت کا کیا جاتا؟ نقصان میرا ہوتا۔

سرے سے ٹیلیے: آپ کا قصیدہ بعد اصلاح بھیجا۔ اس کی رسید آئی۔ کئی کٹے ہوئے شعر اُلٹے آئے۔ اُن کی قباحت پوچھی گئی، قباحت بتائی گئی۔ الفاظ قبیح کی جگہ بے عیب الفاظ لکھ دئے گئے۔ لو صاحب، یہ اشعار بھی قصیدہ میں لکھ لو۔ اس نگارش کا جواب آج تک نہیں آیا۔ شاہ اسرار الحق کے نام کا کاغذان کو دیا۔ جواب میں جو کچھ انھوں نے زبانی فرمایا آپ کو لکھا گیا۔ حضرت کی طرف سے اس تحریر کا بھی جواب نہ ملا:

پُر ہوں میں شکوے سے، یوں راگ سے جیسے باجا
اک ذرا چھیڑیے پھر دیکھیے کیا ہوتا ہے

سوچتا ہوں کہ دونوں خط بیرنگ گئے تھے۔ تلف ہونا کسی طرح متصور نہیں۔ خیر اب بہت دن کے بعد شکوہ کیا لکھا جائے؟ باسی کڑھی میں اُبال کیا آئے؟ بندگی بیچارگی۔

پانچ لشکر کا حملہ پے در پے اس شہر پر ہُوا: پہلا باغیوں کا لشکر، اس میں اہلِ شہر کا اعتبار لُٹا۔ دوسرا لشکر خاکیوں کا، اس میں جان و مال و ناموس و مکان و مکین و آسمان و زمین و آثار ہستی سراسر لُٹ گئے۔ تیسرا لشکر کال کا، اس میں ہزار ہا آدمی بھوکے مرے۔ چوتھا لشکر ہیضے کا، اس میں بہت سے پیٹ بھرے مرے۔ پانچواں لشکر تپ کا، اس میں تاب و طاقت عموماً لُٹ گئی۔ مرے آدمی کم، لیکن جس کو تپ آئی، اس نے پھر اعضا میں طاقت نہ پائی۔ اب تک اس لشکر نے شہر سے کوچ نہیں کیا۔ میرے گھر دو آدمی تپ میں مبتلا ہیں: ایک بڑا لڑکا اور ایک میرا داروغہ۔ خدا ان دونوں کو جلد صحت دے۔

برسات یہاں بھی اچھی ہوئی ہے، لیکن نہ ایسی کہ جیسی کالپی اور بنارس میں۔ زمیندار خوش، کھیتیاں تیار ہیں۔ خریف کا بیڑا پار ہے۔ ربیع کے واسطے پوہ ماہ میں مینہ درکار ہے۔ کتاب کا پارسل پرسوں ارسال کیا جائے گا۔

اہاہا! جناب حافظ محمد بخش صاحب! میری بندگی۔ مغل علی خاں غدر سے کچھ دن پہلے مستقی ہو کر مر گئے۔ ہے ہے کیوں کر لکھوں؟ حکیم رضی الدین خاں کو قتل عام میں ایک خاکی نے گولی ماردی اور احمد حسین خاں ان کے چھوٹے بھائی اسی دن مارے گئے۔ طالع یار خاں کے دو بیٹے رخصت لے کر آئے تھے، غدر کے سبب نہ جاسکے، یہیں رہے۔ بعد فتح دہلی دونوں بے گناہوں

کو پھانسی ملی۔ طالع یار خاں ٹونک میں ہیں۔ زندہ ہیں پر یقین ہے کہ مردے سے بدتر ہوں گے۔ میر چھوٹم نے بھی پھانسی پائی۔ حال صاحبزادہ میاں نظام الدین کا یہ ہے کہ جہاں سب اکابر شہر سے بھاگے تھے، وہاں وہ بھی بھاگ گئے تھے۔ بڑودہ میں رہے، اورنگ آباد میں رہے، حیدرآباد میں رہے، سال گزشتہ یعنی جاڑوں میں یہاں آئے۔ سرکار سے ان کی صفائی ہوگئی۔ لیکن صرف جان بخشی۔ روشن الدولہ کا مدرسہ، جو عقب کوتوالی چبوترہ ہے، وہ اور خواجہ قاسم کی حویلی، جس میں مغل علی خاں مرحوم رہتے تھے، وہ اور خواجہ صاحب کی حویلی، یہ املاک خاص حضرت کالے صاحب کی اور کالے صاحب کے بعد میاں نظام الدین کی قرار پا کر ضبط ہوئی اور نیلام ہو کر روپیہ سرکار میں داخل ہوگیا۔ ہاں قاسم جان کی حویلی جس کے کاغذ میاں نظام الدین کی والدہ کے نام ہیں، وہ ان کو یعنی میاں نظام الدین کی والدہ کو مل گئی ہے۔ فی الحال میاں نظام الدین پاکپٹن گئے ہیں۔ شاید بہاول پور بھی جائیں گے۔

۱۸۶۰ء (غالب)

(۹۸)

پیرومرشد

شب رفتہ کو مینہ برسا۔ ہوا میں فرط برودت سے گزند پیدا ہوگیا۔ اب صبح کا وقت ہے۔ ہوا ٹھنڈی بے گزند چل رہی ہے۔ ابر تنک محیط ہے۔ آفتاب نکلا ہے، پر نظر نہیں آتا ہے۔ میں عالم تصور میں آپ کو مسند عز و جاہ پر جانشین اور منشی نادر حسین خاں صاحب کو آپ کا جلیس مشاہدہ کر کے آپ کی جناب میں کورنش بجالاتا ہوں اور منشی صاحب کو سلام کرتا ہوں۔ کافر نعمت ہو جاؤں اگر یہ مدارج بجانہ لاؤں۔ حضرت نے اور منشی صاحب نے میری خاطر سے کیا زحمت اٹھائی ہے۔ بھائی صاحب بہت خوشنود ہوئے۔ منت پذیری میں میرے شریک غالب ہیں۔ فی الحال بہ توسط میرے سلام نیاز عرض کرتے ہیں۔ اغلب ہے کہ نامہ جداگانہ بھی ارسال کریں۔

حضرت! آپ غالب کی شرارتیں دیکھتے ہیں؟ سب کچھ کہے جاتا ہے اور اس اصل کا کہ جس پر یہ مراتب متفرع ہوں، ذکر نہیں کرتا۔ فقیر کو یہ طرز پسند نہ آئی۔ مطلب اصلی کو مقدر چھوڑ جانا

کیا شیوہ ہے؟ یوں لکھنا تھا کہ آپ کا عنایت نامہ' اس کے ساتھ نسب نامۂ خاندان مجد و علا کا پارسل پہنچا۔ میں ممنون ہوا' نواب ضیاء الدین خاں بہادر ممنون و شاکر ہوئے۔ جناب عالی میں تو غالب ہرزہ سرا کا معتقد نہ رہا۔ آپ نے اس کو مصاحب بنا رکھا ہے۔ اس سے اس کا دماغ چل گیا ہے۔ قبلہ و کعبہ جناب مولانا قلق کی خدمت میں حضرت شفق نے جو غالب کی شفاعت کی تھی' وہ مقبول نہ ہوئی۔ اب جناب ہاشمی کو اپنا ہم زبان اور مددگار بنا کر پھر کہتے ہیں آپ کی بات اس باب میں کبھی نہ مانوں گا' جب تک سید صاحب کا خوشنودی نامہ نہ بھجوائے گا۔ اس سارٹیفکٹ کے حصول میں رشوت دینے کو بھی موجود ہوں۔ والسلام

(۹۹)

ہرگز نہ میرد آنکہ دلش زندہ شد بہ عشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

خداوند نعمت!

آج دوشنبہ ٦ رمضان کی اور ۱۵ فروری کی ہے۔ اس وقت کہ بارہ پر تین بجے ہیں عطوفت نامہ پہنچا۔ اُدھر پڑھا' اِدھر جواب لکھا۔ ڈاک کا وقت نہ رہا۔ خط کو معنون کر رکھتا ہوں۔ کل شنبہ ۱٦ فروری کو ڈاک میں بھجوا دوں گا۔ سالِ گزشتہ مجھ پر بہت سخت گزرا۔ بارہ تیرہ مہینے صاحب فراش رہا۔ اٹھنا دشوار تھا' چلنا پھرنا کیسا؟ نہ تپ' نہ کھانسی' نہ اسہال' نہ فالج' نہ لقوہ' ان سب سے بدتر ایک صورت پُر کدورت' یعنی احتراق کا مرض۔ مختصر یہ کہ سر سے پاؤں تک بارہ پھوڑے۔ ہر پھوڑہ ایک زخم' ہر زخم ایک غار' ہر روز بے مبالغہ بارہ تیرہ پھائے اور پاؤ بھر مرہم درکار۔ نو دس مہینے بے خور و خواب رہا ہوں اور شب و روز بے تاب۔ راتیں یوں گزری ہیں کہ اگر کبھی آنکھ لگ گئی' دو گھڑی غافل رہا ہوں گا کہ ایک آدھ پھوڑے میں ٹیس اٹھی۔ جاگ اٹھا' تڑپا کیا' پھر سو گیا۔ پھر ہوشیار ہو گیا۔ سال بھر میں سے تین حصے دن یوں گزرے' پھر تخفیف ہونے لگی۔ دو تین مہینے میں لوٹ پوٹ کر اچھا ہو گیا۔ نئے سر سے روح قالب میں آئی۔ اجل نے میری سخت جانی کی قسم کھائی۔ اب اگر تندرست ہوں لیکن ناتوان و سست ہوں۔ حواس کھو بیٹھا' حافظہ کو رو بیٹھا۔ اگر اُٹھتا

ہوں تو اتنی دیر میں اُٹھتا ہوں کہ جتنی دیر میں ایک قدِ آدم دیوار اُٹھے۔ آپ کی پُرسش کے کیوں نہ قربان جاؤں کہ جب تک میرا مرنا نہ سُنا' میری خبر نہ لی۔ میری مرگ کے مخبر کی تقریر اور مثلاً میری یہ تحریر آدھی سچ اور آدھی جھوٹ۔ درصورت مرگ نیم مردہ اور درحالت حیات نیم زندہ ہوں:

در کشاکش ضعفم نگسلد رواں از تن
اینکہ من نمی میرم ہم ز ناتوانیہاست

اگر ان سطور کی نقل میرے مخدوم' مولوی غلام غوث خاں صاحب بہادر میر منشی لفٹنٹ گورنری غرب وشمال کے پاس بھیج دیجئے گا تو ان کو خوش اور مجھ کو ممنون کیجئے گا۔

دوشنبہ ۶ رمضان ۱۲۸۰ھ ۱۵ فروری ۱۸۶۴ء

حکیم غلام نجف خاں

(۱۰۰)

صاحب'

کل آخر روز تمھارا خط آیا۔ مَیں نے پڑھا' آنکھوں سے لگایا' پھر بھائی ضیاء الدین خاں صاحب کے پاس بھجوایا۔ یقین ہے کہ انھوں نے پڑھ لیا ہوگا۔ ما کتب فیہ معلوم کیا ہوگا۔ تمھارے یہاں نہ ہونے سے ہمارا دل گھبراتا ہے۔ کبھی کبھی ناگاہ ظہیر الدین کا آنا یاد آتا ہے۔ کہو اب خیر سے کب آؤ گے؟ کئی برس' کئی مہینے کے دن راہ دکھاؤ گے؟ یہاں کا حال جیسا کہ دیکھ گئے ہو بدستور ہے:

زمیں سخت ہے آسماں دُور ہے

جاڑا پڑ رہا ہے تو انگر غرور سے' مفلس سردی سے اکڑ رہا ہے۔ آبکاری کے بندوبست جدید نے مارا' عرق کے نہ کھینچنے کی قید شدید نے مارا۔ ادھر انسداد دروازۂ آبکاری ہے' ادھر ولایتی عرق کی قیمت بھاری ہے۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔

مولوی فضل رسول صاحب حیدرآباد گئے ہیں۔ مولوی غلام امام شہید آگئے سے وہاں

ہیں۔ مجی الدولہ محمد یار خاں سورتی نے ان صورتوں کو وہاں بلایا ہے، پر یہ نہیں معلوم کہ وہاں ان کو کیا پیش آیا ہے۔ اگر تم کو معلوم ہو گیا ہو تو مجھ کو ضرور لکھو۔ زیادہ کیا لکھوں؟

کیوں ظہیر الدین، کیا میں اس لائق نہ تھا کہ تو ایک خط مجھ کو الگ لکھتا یا اپنے باپ کے خط میں اپنے ہاتھ سے اپنی بندگی لکھتا؟ حکیم غلام نجف خاں خط لکھنے بیٹھے، میری بندگی لکھ دی۔ تیرے فرشتوں کو بھی خبر نہیں۔ اس بندگی کے آنے کی مجھے کیا خوشی؟

صبح یک شنبہ ۱۱۔ جنوری ۱۸۶۳ء غالب

نواب یوسف میرزا

(۱۰۱)

یوسف میرزا،

میرا حال سوائے میرے خدا اور خداوند کے کوئی نہیں جانتا۔ آدمی کثرت غم سے سودائی ہو جاتے ہیں، عقل جاتی رہتی ہے۔ اگر اس ہجوم غم میں میری قوت متفکرہ میں فرق آ گیا ہو تو کیا عجب ہے، بلکہ اس کا باور نہ کرنا غضب ہے۔ پوچھو کہ غم کیا ہے؟ غم مرگ، غم فراق، غم رزق، غم عزت۔ غم مرگ میں قلعہ نا مبارک سے قطع نظر کر کے اہل شہر کو گنتا ہوں: مظفر الدولہ، میر ناصر الدین، میرزا عاشور بیگ، میرا بھانجا، اس کا بیٹا احمد میرزا، انیس برس کا بچہ، مصطفیٰ خاں ابن اعظم الدولہ، اس کے دو بیٹے ارتضیٰ خاں اور مرتضیٰ خاں، قاضی فیض اللہ، کیا میں ان کو اپنے عزیزوں کے برابر نہیں جانتا تھا؟ اے لو، بھول گیا۔ حکیم رضی الدین احمد خاں، میر احمد حسین میکش، اللہ اللہ ان کو کہاں سے لاؤں؟ غم فراق حسین میرزا، میر مہدی، میر سرفراز حسین، میرن صاحب، خدا ان کو جیتا رکھے۔ کاش یہ ہوتا کہ جہاں ہوتے، وہاں خوش ہوتے! گھر اُن کے بے چراغ، وہ خود آوارہ۔ سجاد اور اکبر کے حال کا جب تصور کرتا ہوں، کلیجہ ٹکڑے ٹکڑے ہوتا ہے۔ کہنے کو ہر کوئی ایسا کہہ سکتا ہے، مگر میں علی کو گواہ کر کے کہتا ہوں کہ ان اموات کے غم میں اور زندوں کے فراق میں عالم میری نظر میں تیرہ و تار ہے۔

حقیقی میرا ایک بھائی دیوانہ مر گیا۔ اس کی بیٹی، اس کے چار بچے، اس کی ماں یعنی میری

بھاوج، جے پور میں پڑے ہوئے ہیں۔ اس تین برس میں ایک روپیہ ان کو نہیں بھیجا۔ بھتیجی کیا کہتی ہوگی کہ میرا بھی کوئی چچا ہے، یہاں اغنیا اور امرا کے ازواج اور اولاد بھیک مانگتے پھریں اور مَیں دیکھوں! اس مصیبت کی تاب لانے کو جگر چاہیے۔

اب خاص اپنا دکھ روتا ہوں۔ ایک بیوی دو بچے، تین چار آدمی گھر کے، کلو، کلیان، ایاز، یہ باہر داری کی جورو بچے بدستور، گویا مداری موجود ہے۔ میاں گھمسن گئے گئے مہینا بھر سے آ گئے کہ بھوکا مرتا ہوں۔ اچھا بھائی تم بھی رہو۔ ایک پیسے کی آمد نہیں، بیس آدمی روٹی کھانے والے موجود۔ مقام معلوم سے کچھ آئے جاتا ہے وہ بقدر سدِ رمق ہے۔ محنت وہ ہے کہ دن رات میں فرصت کام سے کم ہوتی ہے۔ ہمیشہ ایک فکر برابر چلی جاتی ہے۔ آدمی ہوں، دیو نہیں، بھوت نہیں۔ ان رنجوں کا تحمل کیوں کر کروں؟ بڑھاپا، ضعف قویٰ، اب مجھ کو دیکھو تو جانو میرا کیا رنگ ہے۔ شاید کوئی دو چار گھڑی بیٹھتا ہوں، ورنہ پڑا رہتا ہوں، گویا صاحبِ فراش ہوں۔ نہ کہیں جانے کا ٹھکانہ، نہ کوئی میرے پاس آنے والا۔ وہ عرق، جو بقدر طاقت، بنائے رکھتا تھا، اب میسر نہیں۔ سب سے بڑھ کر آمد آمد گورنمنٹ کا ہنگامہ ہے۔ دربار میں جاتا تھا، خلعت فاخرہ پاتا تھا، وہ صورت اب نظر نہیں آتی۔ نہ مقبول ہوں، نہ مردود ہوں، نہ گنہ گار ہوں، نہ مخبر، نہ مفسد۔ بھلا اب تم ہی کہو اگر یہاں دربار ہوا اور مَیں بلایا جاؤں تو نذر کہاں سے لاؤں؟ دو مہینے دن رات خون جگر کھایا اور ایک قصیدہ چونسٹھ بیت کا لکھا۔ محمد افضل مصور کو دیا، وہ پہلی دسمبر کو مجھے دے گا۔ یہ اس کا مطلع ہے:

ز سال نو دگر آبے بروئے کار آمد
ہزار و ہشت صد و شصت در شمار آمد

اس میں التزام اپنی تمام سرگزشت کے لکھنے کا ہے۔ اس کی نقل تم کو بھیجوں گا۔

میرے آقازادہ روشن گہر، جناب مفتی میر عباس صاحب کو دکھانا۔ اب بجھے ہوئے بلکہ مرے ہوئے دل پر کلام کا یہ اُسلوب ہے۔

جہاں پناہ! کی مدح کی فکر نہ کر سکا۔ یہ قصیدہ ممدوح کی نظر سے گزرا نہ تھا، مَیں نے اسی میں امجد علی شاہ کی جگہ واجد علی شاہ کو بٹھا دیا۔ خدا نے بھی تو یہی کیا تھا۔ انوری نے بارہا ایسا کیا ہے کہ ایک قصیدہ دوسرے کے نام پر کر دیا۔ مَیں نے اگر باپ کا قصیدہ بیٹے کے نام کر دیا تو کیا

غضب ہوا۔ پھر کیسی حالت اور کیسی مصیبت میں کہ جس کا ذکر بطریق اختصار اوپر لکھ آیا ہوں۔ اس قصیدے سے مجھ کو غرض دستگاہ سخن منظور نہیں، گدائی منظور ہے۔

بہ ہر حال یہ تو کہو قصیدہ پہنچا یا نہیں؟ پرسوں تمھارے ماموں کا خط آیا، اس میں قصیدے کے پہنچنے کا ذکر نہیں۔ اس تفرقہ کو مٹاؤ اور صاف لکھو کہ قصیدہ پہنچا یا نہیں؟ اگر پہنچا تو حضور میں گزرا یا نہیں؟ اگر گزرا تو کس کی معرفت گزرا؟ اور کیا حکم ہوا؟ یہ امور جلد لکھو اور ہاں یہ بھی لکھو کہ املاک واقع شہر دہلی کے باب میں کیا حکم ہوا؟

مَیں تم کو اطلاع دیتا ہوں کہ کل مَیں نے فرد فہرست دیہات و باغات و املاک مع حاصل ہر یک باغ و دہ و ملک، ناظر جی کو بھیج دی ہے۔ اس خط سے ایک دن پہلے وہ فرد پہنچے گی۔ یہ فرد کلکٹری کے دفتر سے لی ہے، مگر اتنا معلوم ہے کہ شہر کی عمارت جو سڑک میں نہیں آئی اور برسات میں ڈھے نہیں گئی، وہ سب خالی پڑی ہے۔ کرایہ دار کا نام نہیں۔ مجھ کو یہاں کی املاک کا علاقہ حسین میرزا کے واسطے مطلوب ہے، مَیں تو پنسن کے باب میں حکم اخیر سن لوں، پھر رام پور چلا جاؤں گا۔ جمادی الاول سے ذی الحجہ تک آٹھ مہینے اور پھر محرم سے ۱۲۷۷ھ سال شروع ہوگا۔ اس کے دو، چار، حد دس گیارہ مہینے غرضیکہ انیس بیس مہینے ہر طرح بسر کرنے ہیں۔ اس میں رنج و راحت، ذلت و عزت جو مقسوم میں ہے وہ پہنچ جائے اور پھر علی علی کہتا ہوا ملک عدم آباد کو چلا جاؤں۔ جسم رام پور میں اور روح عالم نور میں "یا علی" "یا علی" "یا علی"۔

میاں ہم تمھیں ایک اور خبر لکھتے ہیں۔ برھما کا پتر دو دن بیمار پڑا رہا، تیسرے دن مر گیا۔ ہے ہے کیا نیک بخت، غریب لڑکا تھا۔ باپ اس کا شیو جی رام اس کے غم میں مردہ سے بدتر ہے۔ یہ دو مصاحب میرے یوں گئے: ایک مردہ، ایک دل افسردہ، کون ہے جس کو تمھارا سلام کہوں؟ یہ خط اپنے ماموں صاحب کو پڑھا دینا اور فرداں سے لے کر پڑھ لینا اور جس طرح ان کی رائے میں آئے اس پر حصول مطلب کی بناء اٹھانا اور ان سب مدارج کا جواب شتاب لکھنا۔

ضیاء الدین خاں رہتک چلے گئے اور وہ کام نہ کر گئے۔ دیکھئے آ کر کیا کہتے ہیں یا رات کو آ گئے ہوں یا شام تک آ جائیں۔ کیا کروں کس کے دل میں اپنا دل ڈالوں۔ بمرتضیٰ علی پہلے سے نیت میں یہ ہے کہ جو شاہ اودھ سے ہاتھ آئے، حصہ برادرانہ کروں۔ نصف حسین میرزا اور

تم اور سجادؔ نصف میں ۔مفلسوں کا مدارِ حیات خیالات پر ہے، مگر انھیں خیالات سے اُن کا حسن طبیعت معلوم ہو جاتا ہے۔ والسلام خیر ختام۔

دوشنبہ دوم جمادی الاول ۱۲۷۶ھ مطابق ۲۸ نومبر ۱۸۵۹ء وقتِ صبح۔ (غالب)

(۱۰۲)

یوسف میرزا!

کیوں کر تجھ کو لکھوں کہ تیرا باپ امر گیا اور اگر لکھوں تو پھر آگے کیا لکھوں کہ اب کیا کرو، مگر صبر؟ یہ ایک شیوۂ فرسودہ ابنائے روزگار کا ہے۔ تعزیت یوں ہی کیا کرتے ہیں اور یہی کہا کرتے ہیں کہ صبر کرو۔ ہائے ایک کا کلیجہ کٹ گیا اور لوگ اُسے کہتے ہیں کہ تو نہ تڑپ۔ بھلا کیوں کر نہ تڑپے گا۔ صلاح اس امر میں نہیں بتائی جاتی۔ دوا کو دخل نہیں، دوا کا لگاؤ نہیں۔ پہلے بیٹا مرا، پھر باپ مرا۔ مجھ سے اگر کوئی پوچھے کہ بے سروپا کس کو کہتے ہیں تو میں کہوں گا یوسف میرزا کو۔

تمھاری دادی لکھتی ہیں کہ رہائی کا حکم ہو چکا تھا، یہ بات سچ ہے؟ اگر سچ ہے تو جوانمرد ایک بار دونوں قیدوں سے چھوٹ گیا۔ نہ قیدِ حیات رہی نہ قیدِ فرنگ۔ ہاں صاحب وہ لکھتے ہیں کہ پنسن کا روپیہ مل گیا تھا۔ وہ تجہیز وتکفین کے کام آیا۔ یہ کیا بات ہے؟ جو مجرم ہو کر چودہ برس کو مقید ہوا ہو اس کا پنسن کیوں کر ملے گا اور کس کی درخواست سے ملے گا؟ رسید کس سے لی جائے گی؟

مصطفیٰ خاں کی رہائی کا حکم ہوا، مگر پنسن ضبط۔ ہر چند اس پُرسش سے کچھ حاصل نہیں، لیکن بہت عجیب بات ہے، تمھارے خیال میں جو کچھ آئے وہ مجھ کو لکھو۔ دوسرا امر یعنی تبدیل مذہب، عیاذاً باللہ! علی کا غلام کبھی مرتد نہ ہوگا۔ ہاں یہ ٹھیک ہے کہ حضرت چالاک اور سخن ساز اور ظریف تھے۔ سوچے ہوں گے کہ ان دموں میں اپنا کام نکالو اور رہا ہو جاؤ۔ عقیدہ کب بدلتا ہے۔ اگر یہ بھی تھا تو اُن کا گمان غلط تھا۔ اس طرح رہائی ممکن نہیں۔ قصہ مختصر تمھاری دادی کا خط جو تمھارے بھائی نے مجھ کو بھیجا تھا، وہ میں نے تمھارے ماموں کو بھیج دیا۔ ان کی جاداد کی واگزاشت کا حکم تو ہو گیا ہے، اگر ان کے بڑے بھائی کے یار ان کو چھوڑیں۔ دیکھئے انجام کار کیا ہوتا ہے۔

مظفر میرزا کو دعا پہنچے۔ تمھارا خط جواب طلب نہ تھا تمھارے چچا کا آغاز اچھا ہے، خدا کرے انجام اسی آغاز کے مطابق ہو۔ ان کا مقدمہ دیکھ کر تمھاری پھوپھی کا اور تمھارا سرانجام

دیکھا جائے گا کہ کیا ہوتا ہے۔ ہوگا کیا؟ اگر جاداویں مل بھی گئیں تو قرضدار دام دام لیں گے۔ رازق حقیقی پنسن دلوادے کہ روٹی کا کام چلے۔ جناب میر قربان علی صاحب کو میرا سلام نیاز اور میر کاظم علی کو دعا۔

مرقومہ شنبہ ۷ شوال (۱۲۷۶ھ) ۱۹ مئی سال حال (۱۸۶۰ع)

غالب

نواب میر غلام بابا خاں

(۱۰۳)

جناب سید صاحب قبلہ:

بعد بندگی عرض کرتا ہوں کہ عنایت نامہ آپ کا پہنچا۔ آپ جو فرماتے ہیں کہ تو اپنی خیریت کبھی کبھی لکھا کر، آگے اتنی طاقت باقی تھی کہ لیٹے لیٹے کچھ لکھتا تھا، اب وہ طاقت بھی زائل ہوگئی۔ ہاتھ میں رعشہ پیدا ہوگیا، بینائی ضعیف ہوگئی۔ متصدی نوکر رکھنے کا مقدور نہیں۔ عزیزوں اور دوستوں میں سے کوئی صاحب وقت پر آ گئے تو میں مطلب کہتا گیا، وہ لکھتے گئے۔ یہ حسن اتفاق ہے کہ کل آپ کا خط آیا، آج ہی ایک دوست میرا آ گیا کہ یہ چند سطریں لکھوا دیں اور یہ آپ کبھی نہ فرمائیں کہ منشی میاں داد خاں سے مجھے قطع محبت ہوگیا ہے۔ منشی صاحب کی محبت اور ان کے توسط سے آپ کی محبت دل و جان میں اس قدر سما گئی ہے، جیسا اہل اسلام میں ملکہ ایمان کا۔ پس ایسی محبت کا موقوف ہونا کبھی ممکن نہیں۔ امراض جسمانی کا بیان اور اخلاص ہمدگر کی شرح کے بعد ہجوم غم ہائے نہانی کا ذکر کیا کروں؟ جیسا ابر سیاہ چھا جاتا ہے یا ٹڈی دل آتا ہے۔ بس اللہ ہی اللہ ہے۔ سیف الحق منشی میاں داد خاں کو سلام کہیے گا اور یہ خط پڑھا دیجئے گا۔

روز چہار شنبہ ۱۶ اپریل ۱۸۶۸ع نجات کا طالب، غالب

نواب ابراھیم علی خاں وفا

(۱۰۴)

ولی نعمت کو غالب کی بندگی!

بسبب ضعف پیری کے خدمت گزاری میں درنگ واقع ہو جائے تو معاف رہوں، کبھی قاصر نہ رہوں گا، انشاء اللہ العظیم۔ دو غزلوں میں سے ایک غزل بعد اصلاح پہنچتی ہے، دوسری غزل ہفتہ آئندہ میں پہنچ جائے گی۔ ضعف اعضا اور دوام مرض سے علاوہ اختلال حواس کا کیا حال لکھوں۔ دو تین دن ہوئے کہ قبلہ و کعبہ میر عالم علی خاں کا خط آیا۔ وہ لکھتے ہیں کہ آزردہ تخلص کی دو غزلیں اصلاحی پہنچیں۔ دیکھئے اس سہو کو کس کی غزلیں کس کو پہنچیں۔ مزا اس میں ہے کہ اب یہ بھی یاد نہیں آتا کہ آزردہ کا نام کیا ہے اور وہ کون ہے اور کہاں کا ہے؟ شاید اس بندۂ خدا کو حضرت کی غزلیں بھیجی ہوں گی۔ خدا کرے وہ بزرگوار میر صاحب کی غزلیں میر صاحب کی طرح میرے پاس بھیج دے تو میر صاحب کی خدمت میں بھیج دوں۔ اگر ایسا نہ ہوا تو ان غزلوں کو، جو اب آئی ہیں، دیکھوں گا۔ یہ اکہتر برس کی عمر کی خوبی ہے۔ آپ میر صاحب قبلہ کو خط پڑھوا دیجئے گا۔

۱۲ اکتوبر ۱۸۶۷ء لطف و کرم کا طالب، غالب

حکیم سیّد احمد حسن مودودی

(۱۰۵)

سید صاحب قبلہ!

عنایت نامہ مع قصیدہ پہنچا۔ پس و پیش ایک رافت نامہ پیر و مرشد سید ابراھیم علی خاں صاحب بہادر اور ایک عطوفت نامہ قبلہ و کعبہ سید عالم علی خان بہادر کا پہنچا۔ میں علی کا غلام ہوں اور اولادِ علی کا خانہ زاد، لیکن بوڑھا اور ناتوان اور مسلوب الحواس اور بے سروسامان، خدمت بجا لانے میں عذر کروں تو گنہ گار۔ ورنگ و توقف کا مضائقہ نہیں۔ لایکلف اللہ نفساً الا وسعھا۔

خداوند نعمت کیا تم دلّی کو آباد اور قلعہ کو معمور اور سلطنت کو بدستور سمجھے ہوئے ہو؟ جو حضرت شیخ کا کلام اور صاحبزادہ قطب الدین ابن مولانا فخر الدین علیہ الرحمۃ کا حال پوچھتے ہو؟"
ایں دفتر راگاؤ خورد گاؤ را قصاب برد و قصاب در راہ مرد"

بادشاہ کے دم تک یہ باتیں تھیں۔ خود میاں کالے صاحب مغفور کا گھر اس طرح تباہ ہوا کہ جیسے جھاڑو پھیر دی۔ کاغذ کا پُرزا سونے کا تارِ پشمینہ کا بال باقی نہ رہا۔ شیخ کلیم اللہ جہاں آبادی رحمۃ اللہ علیہ کا مقبرہ اُجڑ گیا۔ ایک اچھے گاؤں کی آبادی تھی۔ اُن کی اولاد کے لوگ تمام اس موضع میں سکونت پذیر تھے۔ اب ایک جنگل ہے اور میدان میں قبر اس کے سوا کچھ نہیں۔ وہاں کے رہنے والے اگر گولی سے بچے ہوں گے تو خدا ہی جانتا ہوگا کہ کہاں ہیں۔ اُن کے پاس شیخ کا کلام بھی تھا' کچھ تبرکات بھی تھے۔ اب جب وہ لوگ ہی نہیں تو کس سے پوچھوں؟ کیا کروں؟ کہیں سے یہ مدعا حاصل نہ ہو سکے گا۔

سید صاحب قبلہ کیوں تکلیف کرتے ہیں؟ اگر یہی مرضی ہے تو اتحاف واہدا تکلف محض ہے۔ فقیر بے سوال ہوں' اگر کچھ بھیج دیں گے، رد نہ کروں گا۔ کم و بیش پر نظر نہ کریں' جتنے کا چاہیں نوٹ خط میں لپیٹ کر بھیج دیں۔ والسلام

(روز شنبہ یکم ستمبر ۱۸۶۳ء) ازاسد اللہ

(۱۰۶)

پیر و مرشد'

آپ کو میرے حال کی بھی خبر ہے؟ ضعف نہایت کو پہنچ گیا۔ رعشہ پیدا ہو گیا۔ بینائی میں بڑا فتور پڑا۔ حواس مختل ہو گئے۔ جہاں تک ہو سکا احباب کی خدمت بجا لایا۔ اوراق اشعار لیٹے لیٹے دیکھتا تھا اور اصلاح دیتا تھا۔ اب نہ آنکھ سے اچھی طرح سوجھے' نہ ہات سے اچھی طرح لکھا جائے۔ کہتے ہیں شاہ شرف علی بو قلندر کو بسبب کبر سن کے خدا تعالیٰ نے فرض اور پیغمبرؐ نے سنت معاف کر دی تھی۔ میں متوقع ہوں کہ میرے دوست خدمت اصلاح اشعار مجھ پر معاف کریں۔ خطوط شوقیہ کا جواب جس صورت سے ہو سکے گا' لکھ دیا کروں گا۔

زیادہ حدادب'

۸۔ اپریل ۱۸۶۶ء راقم اسد اللہ خاں غالب

تفضل حسین خاں

(۱۰۷)

کیوں صاحب!

یہ چچا بھتیجا ہونا اور شاگردی واستادی سب پر پانی پھر گیا؟ اگر کوئی ہزار پانسو کی چیز ہوتی اور مَیں تم سے مانگتا تو خدا جانے تم کیا غضب ڈھاتے۔ میرا کلام خرید آٹھ دس روپیہ کی، سو وہ بھی مَیں نہیں کہتا کہ مجھ کو دے ڈالو۔ تم کو مبارک رہے۔ مجھ کو مستعار دو۔ مَیں اس کو دیکھ لوں، پھر تم کو واپس بھیج دوں گا۔ اس طرح کی طلب پر نہ دینا، دلیل اس کی ہے کہ مجھ کو جھوٹا جانتے ہو، میرا اعتبار نہیں پایا ہے کہ مجھ کو آزار دینا اور ستانا بہ دل مطلوب ہے۔ وہ کتاب ابھی میرے آدمی کو دے دو۔ باللہ واللہ اس میں سے جو میرے پاس نہیں ہے نقل کر کے تم کو بھیج دوں گا۔ اگر تم کو واپس نہ دوں تو مجھ پر لعنت اور اگر تم میری قسم نہ مانو اور کتاب حاملِ رقعہ کو نہ دو، تو تم کو آفریں۔

غالب

میاں داد خاں سیاح

(۱۰۸)

سعادت و اقبال نشان، منشی میاں داد خاں سے مَیں بہت شرمندہ ہوں کہ ان کے خطوط کا جواب نہیں لکھا۔ غزلوں کے مسودے گُم ہو گئے۔ اس شرمندگی سے پانچ نگارنہ ہوا۔ اب یہ سطریں جو لکھتا ہوں، اُس خط کے جواب میں ہیں، جو بنارس سے آیا ہے۔

بھائی، بنارس خوب شہر ہے اور میرے پسند ہے۔ ایک مثنوی مَیں نے اس کی تعریف میں لکھی ہے اور "چراغِ دیر" اس کا نام رکھا ہے۔ وہ فارسی دیوان میں موجود ہے، اس کو دیکھنا۔

اشرف حسین خان صاحب میرے دوست ہیں۔ فتنہ و فساد کے زمانے سے بہت پہلے ان کا خط اور کچھ ان کا کلام میرے پاس آیا ہے۔ تم ان کو میرا سلام کہنا اور مَیں تم سے یہ توقع رکھتا ہوں کہ جس طرح تم نے لکھنؤ سے بنارس تک کے سفر کی سرگزشت لکھی ہے، اسی طرح آئندہ بھی لکھتے رہو گے۔ مَیں سیر و سیاحت کو بہت دوست رکھتا ہوں۔

اگر بہ دل نہ خلد ہرچہ از نظر گزرد
زہے روانی عمرے کہ در سفر گزرد

خیر اگر سیر و سیاحت میسر نہیں، نہ سہی ''ذکر العیش نصف العیش'' پر قناعت کی۔ میاں داد خاں سیاح کی سرگزشت سیر و سفر ہی سہی۔

غزل تمھاری رہنے دیتا ہوں، اُس کے دیکھنے کی ابھی فرصت نہیں ہے۔ جیسا تم نے وعدہ کیا ہے جب اور غزلیں بھیجو گے اُن کے ساتھ اس کو بھی دیکھ لوں گا، بلکہ احتیاط مقتضی اس کی ہے کہ ان غزلوں کے ساتھ اس کو بھی لکھ بھیجنا۔

ناتوانی زور پر ہے، بڑھاپے نے نکما کر دیا ہے۔ ضعف، سستی، کاہلی، گراں جانی، گرانی۔ رکاب میں پاؤں ہے، باگ پر ہاتھ ہے۔ بڑا سفر دور و دراز درپیش ہے۔ زادِ راہ موجود نہیں۔ خالی ہاتھ جاتا ہوں۔ اگر ناپُرسیدہ بخش دیا تو خیر، اگر باز پُرس ہوئی تو سقر مقر ہے اور ہاویہ زاویہ ہے، دوزخ جاوید ہے اور ہم ہیں۔ ہائے کسی کا ایک اچھا شعر ہے:

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے
مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

اللہ اللہ اللہ!

صبح دوشنبہ ۱۳ دسمبر ۱۸۶۰ء نجات کا طالب، غالب

(۱۰۹)

آیئے بیٹھے مولانا سیاح، السلام علیکم۔ مزاج مبارک۔ سورت کا پہنچنا بہ ہر صورت مبارک ہو۔ بھائی میرا دل بہت خوش ہوا کہ تم اپنے وطن پہنچے، لیکن تم کو چین کہاں؟ خدا جانے کے ہفتے یا کے مہینے ٹھہرو گے اور پھر سیاحت کو نکلو گے۔ جی میں کہو گے آ داب دکن کی سیر کریں۔ حیدر آباد اور رنگ آباد دونوں شہر اچھے ہیں، اُن کو دیکھیں۔

میرزا معین الدین حسین خاں اور میرزا محمد حسین خاں، یہ دونوں بیٹے ہیں نواب قدرت اللہ بیگ خاں کے، اور قدرت اللہ بیگ خاں ابن عم تھے نواب خدا بخش خاں کے اور معین الدین حسین خاں کی بہن منسوب ہے بھائی ضیاء الدین خاں سے۔

یہاں کوئی امر نیا واقع نہیں ہوا وہی حالات و اطوار ہیں جو دیکھ گئے ہو۔ مسجد جامع کے باب میں کچھ پرسشیں لاہور سے آئی تھیں یہاں سے ان کے جواب گئے ہیں۔ یقین ہے کہ واگزار کا حکم آ جائے اور مسلمانوں کو مل جائے۔ ہنوز بدستور پہرا بیٹھا ہوا ہے اور کوئی جانے نہیں پاتا۔ والسلام مع الاکرام۔

صبح شنبہ ۲ ذیقعدہ (۱۲۷۸ھ) ۳ مئی (۱۸۶۲ع) غالب

(۱۱۰)

منشی صاحب سعادت و اقبال نشان

شکوہ تمہارا میرے سر آنکھوں پر مگر کوئی خط تمہارا جواب طلب نہ تھا۔ اشعار کی اصلاح سے مَیں نے ہاتھ اُٹھایا۔ کیا کروں؟ ایک برس سے عوارض فسادِ خون میں مبتلا ہوں۔ بدن پھوڑوں کی کثرت سے سرو چراغاں ہو گیا ہے۔ طاقت نے جواب دیا۔ دن رات لیٹا رہتا ہوں۔ کھانا کھاتے وقت پلنگ پر سے اُتر بیٹھتا ہوں۔ کھانا کھا کر ہاتھ دھو کر پھر پڑ رہتا ہوں۔ حاجتی پلنگ کے پاس لگی رہتی ہے اُتر کر پیشاب کیا جاتا ہے بیت الخلا جانا ایک مصیبت ہے۔ تشت چوکی سہی مگر کئی قدم جانا پھر آنا کیا ایسا آسان ہے۔ ایک کم ستر برس کی عمر ہوئی۔ اب نجات چاہتا ہوں۔ بہت جیا کہاں تک جیوں گا۔ (اب تم دوسرے صفحہ کو پڑھو) جناب نواب سید غلام بابا خاں صاحب کی خدمت میں سلام کہنا اور ولادت فرزند کی مبارک باد دینا اور یہ قطعہ تاریخ نذر کرنا:

میر بابا یافت فرزندے کہ ماہ چار دہ
بر فراز لوح گردوں گردۂ تمثال اوست
فرخی بینی و یابی بہرہ از ناز و طرب
از سر ناز و طرب ''فرزند فرخ فال'' اوست

۱۲۸۰ھ ''ناز'' کے نون کے ''پچاس'' اور ''طرب'' کی طوے کے ''نو'' ''فرخ فال'' پر بڑھانے ہوں گے۔

پنجشنبہ ۱۶۔ اگست ۱۸۶۳ع غالب

(۱۱۱)

سعادت و اقبال نشان، سیف الحق منشی میاں داد خاں سیاح کو فقیر غالب کی دعا پہنچے۔
خط میں آپ نے بہت سے مطالب لکھے۔ مگر تیس کتابوں کے دو پارسلوں کی رسید نہیں لکھی۔ یہ ایک پارسل جو بعد دو پارسلوں کے بھیجا گیا ہے اس میں وہی ''لطائف غیبی'' جس کو میں نے اپنے مطالعے میں رکھ کر صحیح کیا ہے۔ اس کے بھیجنے سے یہ مدعا ہے کہ تم ان تیس رسالوں کو اس کے مطابق صحیح کرلو اور اگر چھوٹے صاحب نے رکھ لیا ہے تو ان سے مستعار لے کر اپنی سب کتابیں صحیح کرلو اور دو نسخہ ان کی نذر کر دو۔
صاحب سَیں نے اپنے صرف زر سے ''لطائف غیبی'' کی جلدیں نہیں چھپوائیں۔ مالک مطبع نے اپنی بکری کو چھاپیں۔ بیس میں نے مول لیں، تیس تم کو دلوا دیں۔ بیس بھائی ضیاء الدین نے لیں، دس مصطفیٰ خاں صاحب نے لیں۔ باقی کا حال مجھے معلوم نہیں۔
دیکھو سیف الحق! سعدیؒ کا قول کیا سچا ہے:

اگر دنیا نہ باشد درد مندم   دگر باشد بہ مہرش پائے بندم
بلائے زیں جہاں آشوب ترنیست   کہ رنج خاطر است، ار ہست در نیست

جہاں دولت نہیں وہاں مصیبت ہے، جہاں دولت ہے وہاں خصومت ہے۔ میں تو میر غلام بابا خاں کا دوست ہوں، اُن کی فتح کی دعا مانگتا ہوں۔ آپ اتنی مہربانی کریں کہ یہ حالات جو واقع ہوا کریں، وہ مجھ کو لکھا کریں۔
غربیلہ کی ہندی ''نخرہ'' ہے، فارسی میں غربیلہ بولتے ہیں۔
پنجم شعبان ۱۲۸۱ھ مطابق ۳۔ جنوری ۱۸۶۵ء   نجات کا طالب، غالب

(۱۱۲)

منشی صاحب، سعادت و اقبال نشان، سیف الحق میاں داد خاں کو فقیر اسد اللہ کا سلام۔
کل سہ شنبہ ۲۰۔ فروری صبح کے وقت چھ پارسل چھتیس ''درفش کاویانی'' کے، نواب میر غلام بابا کی خدمت میں ارسال کیے۔ کل ہی شام کے وقت آپ کا عنایت نامہ پہنچا، حال معلوم ہوا۔ خیر اب اور نہ بھیجوں گا۔

صاحب' یہ تم نے پانچ روپے کے ٹکٹ کیوں بھیجے؟ میں نہ کتاب فروش' نہ دلال' یہ حرکت مجھے پسند نہ آئی اور تم نے بُرا کیا۔ حضرت سولہ جلدیں "لطائف غیبی" کی بھیج کر اس کے پان سات دن کے بعد بیس "نامۂ غالب" کا پارسل ارسال کیا ہے۔ "لطائف" کی رسید تم نے بھیج دی' یقین ہے کہ "نامۂ غالب" کا پارسل بھی پہنچ جائے گا' گھبراؤ نہیں۔ نواب صاحب کی خدمت میں میرا سلام اور اشتیاق ملاقات عرض کرنا۔

۲۱۔ فروری ۱۸۶۶ء نجات کا طالب' غالب

(۱۱۳)

مولانا سیف الحق'

اب تو کوئی خط تمہارا نوٹ اور ہنڈوی اور ٹکٹ سے خالی نہیں ہوتا۔ بھلا یہ تو فرمائیے کہ یہ ڈھائی روپے کس بابت کے اور کس جنس کی قیمت کے ہیں؟ اگلے پانچ روپے پر میں بے مزہ ہوا تھا۔ یہ ڈھائی اور طرہ ہوئے۔ بہ ہر حال ان کا حال لکھو کہ کیسے ہیں اور کاہے کے ہیں؟ اس رقعے کا جواب جلد لکھو۔ ٹوپیاں بعد عید بھیجی جائیں گی۔

۲۳۔ اپریل ۱۸۶۶ء عنایت کا طالب' غالب

(۱۱۴)

صاحب'

میرا سلام۔ تمہارا خط پہنچا۔ دونوں غزلیں دیکھیں۔ خوش ہوا۔ فقیر کا شیوہ خوشامد نہیں اور فن شعر میں اگر اس شیوے کی رعایت کی جائے تو شاگرد ناقص رہ جاتا ہے۔ یاد کرو' کبھی کوئی غزل تمہاری اس طرح کی نہیں ہوئی کہ جس میں اصلاح نہ ہوئی ہو' خصوصاً روزمرہ' اردو میں۔ دونوں غزلیں لفظاً اور معنیً بے عیب ہیں' کہیں اصلاح کی حاجت نہیں۔ آفرین اور صد ہزار آفرین۔

میر غلام بابا صاحب واقعی ایسے ہی ہیں' جیسا تم کہتے ہو' سیاحت میں دس ہزار شخص

تمھاری نظر سے گزرا ہوگا۔ اس گروہ کثیر میں جو تم ایک آدمی کے مداح ہو تو بیشک وہ شخص ہزاروں میں ایک ہے۔ لاریب فیہ۔ کیا فرمائش کروں اور کیا تم سے منگاؤں؟ وہاں کونسی چیز ہے کہ یہاں نہیں۔ آم مجھ کو بہت مرغوب ہیں، انگور سے کم عزیز نہیں، لیکن بمبئی اور سورت سے یہاں پہنچنے کی کیا صورت؟ مالدے کا آم یہاں پیوندی اور ولایتی کر کے مشہور ہے۔ اچھا ہوتا ہے۔ کمال یہ کہ وہاں بہت اچھا ہوگا۔ سورت سے دلی آم بھیجنے محض تکلف ہے۔ روپے کے آم اور چار روپے محصول ڈاک اور پھر سو سے شاید دس پہنچیں۔ میرے سر کی قسم کبھی ایسا ارادہ نہ کرنا۔ یہاں دیسی آم انواع و اقسام کے بہت پاکیزہ، لذیذ اور خوشبو، افراط سے ہیں۔ پیوندی آم بھی بہت ہیں۔ رام پور سے نواب صاحب اپنے باغ کے آموں میں سے اکثر بسبیل ارمغان بھیجتے رہتے ہیں۔ اے لو! آج بریلی سے ایک بہنگی ایک دوست کی بھیجی ہوئی آئی۔ دو ٹوکرے، ہر ٹوکرے میں سو آم۔ کلو داروغہ نے میرے سامنے وہ ٹوکرے کھولے، دو سو میں تراسی آم اچھے نکلے اور ایک سو سترہ آم بالکل سڑے ہوئے۔ اوائل جون ماہ حال میں ایک ہفتہ مینہ برس کر پھر اب وہی آگ برس رہی ہے اور لو چل رہی ہے۔

۱۷۔ جون ۱۸۶۶ء (غالب)

(۱۱۵)

بھائی سیف الحق، تمھارا خط پہنچا۔ قاضی صاحب بڑودہ کو معاف رکھو۔ اگر کوئی وجہ اپنے پران کے عتاب کی پاتا تو ان سے عذر کرتا اور اپنا گناہ معاف کرواتا۔ جب سبب ملال کا ظاہر نہیں تو میں کیا کروں؟ تم بُرا نہ مانو، کس واسطے کہ اگر میں بُرا ہوں تو اس نے سچ کہا اور اگر میں اچھا ہوں اور اس نے بُرا کہا تو اس کو خدا کے حوالے کرو:

غالب بُرا نہ مان جو دشمن بُرا کہیں
ایسا بھی کوئی ہے کہ سب اچھا کہیں جسے

صاحب، اس بڑھاپے میں تصویر کے پردے میں کہاں کھنچا کھنچا پھروں؟ گوشہ نشین آدمی، عکس کی تصویر اُتارنے والے کو کہاں ڈھونڈوں؟ دیکھو ایک جگہ میری تصویر بادشاہ کے دربار میں کھنچی ہوئی ہے، اگر ہاتھ آ جائے گی تو وہ ورق بھیج دوں گا۔

اجی' وہ تو میں نے نواب صاحب کو نسی سے ایک بات لکھی تھی' دوستانہ اختلاط تھا۔ بھئی میں بہرا ہوں' گانا کیا سنوں گا؟ بوڑھا ہوں' ناچ کیا دیکھوں گا؟ غذا چھ ماشے آٹا' کھانا کیا کھاؤں گا؟ بمبئی' سورت میں انگریزی شرابیں ہوتی ہیں' اگر وہاں آتا اور شریک محفل ہوتا تو پی لیتا۔

۵۔ ستمبر ۱۸۶۶ء نجات کا طالب' غالب

(۱۱۶)

منشی صاحب شفیق' بہ دل مہربان' عزیز تر از جان' سیف الحق میاں داد خاں کو فقیر غالب علی شاہ کی دعا پہنچے۔ پرسوں نواب صاحب کا خط آیا۔ صاحب ٹوپیوں کی حقیقت یہ ہے کہ تم نے ''لطائف غیبی'' کی پندرہ جلدیں سات روپے آٹھ آنے دام بھیج کر منگوائیں' پھر دو روپے کے ٹکٹ بھیج کر ٹوپیاں منگوائیں۔ میں نے تمھارے بھیجے ہوئے روپوں کی ٹوپیاں خرید کر تم کو بھیج دیں۔ چاہے تم پہنو' چاہے چھوٹے صاحب کی نذر کرو۔

تمھیں جو میں نے ''سیف الحق'' کا خطاب دیا ہے' اپنی فوج کا سپہ سالار مقرر کیا ہے' تم میرے ہاتھ ہو' تم میرے بازو ہو۔ میرے نطق کی تلوار تمھارے ہاتھ سے چلتی رہے گی۔ ''لطائف غیبی'' نے اعدا کی دھجیاں اڑا دیں۔

ایک نئی بات سنو۔ محمد میرزا خان میرے سلبی بھائی کا نواسا ہے۔ اُس نے ایک اخبار نکالا ہے مسمّٰی بہ ''اشرف الاخبار''۔ اس کا ایک لفافہ تم کو بھیجتا ہوں۔ اس کو پڑھ کر معلوم کرلو گے کہ تمھارا ایک اعتراض قتیل کے کلام پر چھاپا گیا ہے۔ اس ارسال و اعلام سے صرف اطلاع منظور ہے۔ ہاں ایک بات یہ بھی ہے کہ چھوٹے صاحب کی نظر سے بھی گزر جائے اور اس سرکار میں یہ اخبار خرید کیا جائے اور تم ان کی طرف سے حکم خریداری ابتداء جنوری ۱۸۶۷ء سے بنام محمد میرزا خان لکھواور وہ خط اس پتے سے دلی روانہ کرو' جو ان کے اخبار کے آخر میں لکھا ہے۔

حیران ہوں کہ چھوٹے صاحب کے خط کا کیا جواب لکھوں۔ انھوں نے مجھے شرمندہ کیا۔ اپنے کو چھوٹا اور مجھ کو بزرگ لکھا۔ سید تو سب مسلمانوں کے بزرگ ہوتے ہیں۔ میں تو مسلمانوں میں بھی ایک ذلیل' علیل' فقیر' حقیر آدمی ہوں۔ یہ اُن کی بزرگی' ان کی خوبی' ان کی مہربانی ہے۔ حق تعالیٰ اُن کو سلامت رکھے اور اُن مقدمات میں من کل الوجوہ ان کو فتح و ظفر نصیب

ہو۔ میرا سلام کہنا اور یہ عبارت پڑھا دینا۔

ہاں صاحب، برادر بجان برابر میرزا معین الدین حسین خاں بہادر کو میرا سلام کہنا اور کہنا کہ بھائی میرا جی دیکھنے کو بہت چاہتا ہے۔ پہلے برخوردار شہاب الدین خاں صاحب سے پوچھو، وہ اجازت دے تو فوراً ریل پیل کرتے چلے آؤ۔ فقط

سہ شنبہ ۷۔ شوال ۱۲۸۳ھ
مطابق ۱۲۔ فروری ۱۸۶۷ع

دیدار کا طالب، غالب

میر حبیب اللہ ذکا

(۱۱۷)

میرے مشفق، میرے شفیق، مجھ سے ہیچ پوچ کے ماننے والے، مجھ سے بُرے کو اچھا جاننے والے میرے محبّ، میرے محبوب، تم کو میری خبر بھی ہے؟ آگے ناتوان تھا، اب نیم جان ہوں۔ آگے بہرا تھا، اب اندھا ہوا چاہتا ہوں۔ رام پور کے سفر کا رہ آورد ہے، رعشہ وضعف بصر۔ جہاں چار سطریں لکھیں، انگلیاں ٹیڑھی ہوگئیں، حرف سُوجھنے سے رہ گئے۔ اکہتر برس جیا، بہت جیا۔ اب زندگی برسوں کی نہیں، مہینوں اور دنوں کی ہے۔

پہلا خط تمھارا پہنچا، اس سے تمھارا مریض ہونا معلوم ہوا۔ متواتر دوسرا خط مع غزل آیا۔ غزل کو دیکھا۔ سب شعر اچھے اور لطیف۔ حافظے کا یہ حال ہے کہ غزل کی زمین یاد نہیں، اتنا یاد ہے کہ ایک لفظ میں کوئی شعر بدلا گیا تھا۔ غرضکہ وہ غزل بعد مشاہدہ تم کو بھیجی گئی اور لکھا گیا کہ نوید حصول صحت جلد بھیجو۔

کل ایک خط رجسٹری دار آیا، گویا ستارہ دنبالہ دار آیا۔ حیران کہ ماجرا کیا ہے۔ بارے کھولا اور دیکھا۔ خط نوید رفع مرض وحصول صحت سے خالی اور شکوہ ہائے بے جا سے لبریز۔

صاحب، میرے نام کا خط جہاں سے روانہ ہو، وہیں رہ جائے تو رہ جائے، ورنہ دلّی کے ڈاک خانہ میں پہنچ کر کیا مجال ہے، جو مجھ تک نہ پہنچے۔ وہاں کے ڈاک کے کارپردازوں کو اختیار ہے، مکتوب الیہ کو دیں یا نہ دیں۔ آپ مرزا صابر کا تذکرہ مانگتے ہیں؟ اس کا حال یہ ہے کہ غدر سے پہلے چھپا اور غدر میں تاراج ہوگیا۔ اب ایک مجلّد اس کا کہیں نظر نہیں آتا۔

بس اب مجھے اتنا لکھنا باقی ہے کہ اس خط کی رسید اور اپنی خیر و عافیت جلد لکھو۔

صبح جمعہ ۲۵۔ ذی حجہ ۱۲۸۲ھ ۱۲ مئی ۱۸۶۶ء جواب کا طالب' غالب

چودھری عبدالغفور سرور

(۱۱۸)

میرے مشفق، چودھری عبدالغفور صاحب اپنے خط اور قصیدہ بھیجنے کا مجھ کو شکر گزار اور قصیدہ سابق کی اب تک اصلاح نہ پانے سے شرمسار تصور فرمائیں اور ان دونوں قصیدوں کے باہم پہنچنے کا انتظار کریں۔

نوید وصل و بیم ے دہد ستارہ شناس
نکردہ ژرف نگاہے مگر در اختر من

تحقیق کہ اب روئے سخن جناب فیض نصاب، جامع مدارج جمع الجمع، بزم وحدت کے فروزندہ شمع، مستغرق مشاہدہ شاہد ذات، حضرت صاحب عالم قدسی صفات کی طرف ہے اور یہ شعر افتتاح کلام ہے۔

پہلے کچھ باتیں، کہ بادی النظر میں خارج از مبحث معلوم ہوں گی، لکھی جاتی ہیں۔ مَیں پانچ برس کا تھا کہ میرا باپ مرا، نو برس کا تھا کہ چچا مرا۔ اس کی جاگیر کے عوض میری اور میرے شرکاء حقیقی کے واسطے شامل جاگیر نواب احمد بخش خاں، دس ہزار روپے سال مقرر ہوئے۔ انہوں نے نہ دیئے مگر تین ہزار روپے سال۔ اس میں سے خاص میری ذات کا حصہ ساڑھے سات سو روپے سال۔ مَیں نے سرکار انگریزی میں یہ غبن ظاہر کیا۔ کولبرک صاحب بہادر ریزیڈنٹ دہلی اور استرلنگ صاحب بہادر سکرتر گورنمنٹ کلکتہ متفق ہوئے میرا حق دلانے پر۔ ریزیڈنٹ معزول ہو گئے، سکرتر گورنمنٹ بمرگ ناگاہ مر گئے۔

بعد ایک زمانے کے بادشاہ دہلی نے پچاس روپے مہینہ مقرر کیا، ان کے ولی عہد نے چار سو روپے سال۔ ولی عہد اس تقرر کے دو برس بعد مر گئے۔

واجد علی شاہ بادشاہ اودھ کی سرکار سے بہ صلہ مدح گستری پانسو روپے سال مقرر ہوئے، وہ

بھی دو برس سے زیادہ نہ جیے یعنی اگر چہ اب تک جیتے ہیں مگر سلطنت جاتی رہی اور تباہی سلطنت دو ہی برس میں ہوئی۔ و تی کی سلطنت کچھ سخت جان تھی' سات برس مجھ کو روٹی دے کر بگڑی۔ ایسے طالع مربی کُش اور محسن سوز کہاں پیدا ہوتے ہیں؟ اب میں جو والی دکن کی طرف رجوع کروں۔ یاد رہے کہ متوسط مرجائے گا یا معزول ہو جائے گا' اور اگر یہ دونوں امر واقع نہ ہوئے تو کوشش اس کی ضائع ہو جائے گی اور والی شہر مجھ کو کچھ نہ دے گا' اور احیاناً اُس نے سلوک کیا تو ریاست خاک میں مل جائے گی اور ملک میں گدھے کے ہل پھر جائیں گے۔ اے خداوند بندہ پرور' یہ سب باتیں وقوعی اور واقعی ہیں۔

اگر ان سے قطع نظر کر کے قصیدے کا قصد کروں' قصد تو کر سکتا ہوں' تمام کون کرے گا؟ سوائے ایک ملکہ کے کہ وہ پچاس پچپن برس کی مشق کا نتیجہ ہے' کوئی قوت باقی نہیں رہی۔ کبھی جو سابق کی اپنی نظم و نثر دیکھتا ہوں تو یہ جانتا ہوں کہ یہ تحریر میری ہے' مگر حیران رہتا ہوں کہ یہ نثر میں نے کیوں کر لکھی تھی اور یہ شعر کیوں کر کہے تھے؟ عبدالقادر بیدل کا یہ مصرع گویا میری زبان سے ہے:

عالم ہمہ افسانۂ ما دارد و ما ہیچ

پایان عمر ہے۔ دل و دماغ جواب دے چکے ہیں۔ سو روپے رام پور کے' ساٹھ روپے پنسن کے' روٹی کھانے کو بہت ہیں۔ گرانی اور امرزانی امور عامہ میں سے ہے۔ دنیا کے کام خوش و ناخوش چلے جاتے ہیں۔ قافلے کے قافلے آمادۂ رحیل ہیں۔ دیکھو نشی نبی بخش مجھ سے عمر میں چھوٹے تھے' ماہ گزشتہ میں گزر گئے۔ مجھ میں قصیدے کے لکھنے کی قوت کہاں؟ اگر ارادہ کروں تو فرصت کہاں؟ قصیدہ لکھوں' آپ کے پاس بھیجوں' آپ دکن کو بھیجیں۔ متوسط کب پیش کرنے کا موقع پائے؟ پیش کئے پر کیا پیش آئے؟ ان مراحل کے طے ہونے تک میں کیوں کر جیوں گا؟ اناللہ وانا الیہ راجعون۔ لاالٰہ الہ اللہ ولا معبود الا اللہ ولا موجود الا اللہ' کان اللہ ولم یکن شئی واللہ الآن کما کان۔

۱۸۶۰ء (غالب)

تشریحات

خط ۱:

حوالہ ۱۔ امین الدین احمد خاں اور ضیاء الدین احمد خاں نیّر درخشاں۔

۲۔ شرف الدولہ قاسم جان اور اس کے بیٹے فیض اللہ بیگ کا خطاب' فخر الدولہ نواب امین الدین کے والد نواب احمد بخش کا خطاب۔

۳۔ نواب الٰہی بخش معروف (برادر نواب احمد بخش) کی دختر۔

۴۔ زین العابدین عارف کے لڑکے باقر علی خاں وحسین علی خاں' جنھیں عارف کی وفات کے بعد غالب نے پالا۔

۵۔ غالب کے بھائی مرزا یوسف کی بیٹی عزیز النسا جو غلام فخر الدین خاں (بن علی بخش خاں بن الٰہی بخش معروف) سے بیاہی گئی۔

۶۔ مرزا علاؤالدین خاں علائی ابن نواب امین الدین احمد خاں۔

خط ۴:

حوالہ ۱۔ علائی کا چھوٹا بھائی۔ ۲۔ نواب امین الدین احمد خاں۔

خط ۶:

حوالہ ۱۔ ضیاء الدین احمد خاں نیّر۔ ۲۔ یعنی پیدا ہوا۔

۳۔ یعنی شادی ہوئی' بیڑی یعنی بیوی۔

۴۔ عارف کے بچے باقر علی خاں وحسین علی خاں۔ ۵۔ یعنی موت۔

خط ۷:

حوالہ ۱۔ گاؤ شنگ (ہندی) بمعنی آر۔ بیلوں کو ہانکنے کی لکڑی جس کے سرے پر لوہے کی سوئی ہوتی ہے۔ ۲۔ ریاست رام پور۔

خط ۹:

حوالہ ۱۔ نواب نجابت علی والی جھجر کا چھوٹا بیٹا۔متوفی ۱۸۶۲ء۔

۲۔ ابن شیخ نظام الدین ابن خواجہ فخر عالم۔ ۳۔ نواب غلام محی الدین۔

خط ۱۰:

حوالہ ۱۔ وہ لوگ جنھیں انقلاب ۱۸۵۷ء میں حصہ لینے کی پاداش میں جلاوطن کیا گیا۔

۲۔ نواب تفضل حسین خاں' انقلاب ۱۸۵۷ء میں شریک ہوئے۔مکہ معظمہ میں عسرت کی حالت میں فوت ہوئے۔

۳۔ کلیات نظم فارسی۔ ۴۔ نواب ضیاءالدین احمد خاں نیر۔

۵۔ شہاب الدین خاں ثاقب (مشہور شیخ طریقت سے اشتراک اسم کی بناپر انھیں "سہروردی" لکھا ہے)۔

خط ۱۱:

حوالہ ۱۔ نواب الٰہی بخش خاں معروف' غالب کے خسر۔

۲۔ یعنی مکتوب الیہ' علاؤالدین علائی۔ ۳۔ غالب۔

۴۔ غالباً حافظ کا یہ ناصحانہ شعر علائی نے اپنے اتالیق حمزہ خاں کے کہنے پر غالب کو لکھا ہوگا:

چوں پیر شدی حافظ از میکدہ بیروں شو
رندی و سیہ مستی در عہد شباب اولی

خط ۱۲:

حوالہ ۱۔ گزرگاہ۔ ۲۔ چڑیلیں

خط ۱۳:

حوالہ ۱۔ ایسی طوالت جو دلگیر کردے۔

خط ۱۶:

حوالہ ۱۔ نواب کلب علی خاں۔

خط ۱۸:

حوالہ ۱۔ قاطع برہان۔

خط ۲۱:

حوالہ ۱۔ بابو جانی بانکے لال رند، راجہ بھرت پور کے وکیل۔

خط ۲۵:

حوالہ ۱۔ منشی نبی بخش حقیر۔

خط ۲۷:

حوالہ ۱۔ بہ ہزار دشواری۔

خط ۳۲:

حوالہ ۱۔ ''دستنبو'' جو بہ اہتمام منشی شیو نرائن آرام زیر طبع تھی۔

خط ۵۵:

حوالہ ۱۔ راجہ چیت سنگھ سابق والی بنارس کا فرزند۔

خط ۵۸:

حوالہ ۱۔ دستنبو۔

خط ۶۶:

حوالہ ۱۔ ساتھ کھیلنے والا۔

خط ۶۹:

حوالہ ۱۔ چاندنی چوک۔ ۲۔ کیپ ٹاؤن (جنوبی افریقہ)۔

خط ۷۰:

حوالہ ۱۔ حالی نے اسی کرنل سے متعلق غالب کا یہ لطیفہ بیان کیا ہے کہ غدر کے بعد میرزا سامنے آئے تو اس نے پوچھا: ول تم مسلمان؟ میرزا نے کہا: آدھا۔ کرنل نے پوچھا: اس کا مطلب؟ میرزا نے کہا: شراب پیتا ہوں، سؤر نہیں کھاتا (یادگارِ غالب)

خط ۷۶:

حوالہ ۱۔ ٹاؤن ڈیوٹی یا محصول چونگی۔

۲۔ ایک درس گاہ، قائم کردہ مفتی صدر الدین آزردہ۔

خط ۸۲:

حوالہ ۱۔ نواب احمد بخش والی فیروز پور جھرکا لوہارو۔

خط ۹۲:

حوالہ ۱۔ کتاب ''دستنبو'' کا پارسل۔

خط ۹۳:

حوالہ ۱۔ یعنی شراب۔

خط ۹۴:

حوالہ ۱۔ خان بہادر سید محمد خاں، بیجبر کے ماموں۔

خط ۱۰۱:

حوالہ ۱۔ یعنی رام پور سے۔ ۲۔ واجد علی شاہ۔

خط ۱۰۲:

حوالہ ۱۔ میرزا احمد نصیر، لکھنؤ میں رہتے تھے۔

خط ۱۰۸:

حوالہ ۱۔ خاقانی ہند محمد ابراہیم ذوق کا شعر ہے۔

خط ۱۱۷:

حوالہ ۱۔ سفر کا تحفہ۔ ۲۔ میرزا قادر بخش صابر کا تذکرہ ''گلستانِ سخن''۔

خط ۱۱۸:

حوالہ ۱۔ شہزادہ فتح الملک بہادر عرف میرزا فخرو (متوفی ۱۸۵۶ء)۔

''انتخابِ خطوط'' میں غالب کے مکتوب الیہم کا مختصر تعارف

نواب امین الدین احمد خاں والیِ لوہارو:

نواب احمد بخش خاں کے بیٹے تھے۔ نواب الٰہی بخش خاں معروف نواب احمد بخش کے بھائی تھے جو غالب کے خسر ہوئے۔ نواب امین الدین احمد کے دوسرے بیٹے ضیاء الدین احمد خاں (نیر ورخشاں تخلص) تھے۔ نواب احمد بخش ۱۸۳۷ء میں فوت ہوئے۔ نواب امین الدین احمد ۱۸۶۹ء میں فوت ہوئے۔ اُن کے بڑے صاحبزادے اور غالب کے شاگرد نواب علاؤالدین احمد خاں علائی والی ریاست لوہارو ہوئے۔ غالب نے علائی کو اپنا خلیفہ ثانی بنایا تھا۔ علائی ۱۸۸۴ء میں فوت ہوئے۔ امین الدین احمد خاں کے چھوٹے بھائی نواب ضیاء الدین احمد خاں کو جو اُردو میں نیر اور فارسی میں رخشاں تخلص کرتے تھے غالب نے خلیفہ اول بنایا ہوا تھا۔ وہ ۱۸۸۵ء میں فوت ہوئے۔

علاء الدین احمد خاں علائی دہلوی (والیِ لوہارو):

نواب امین الدین احمد خاں (۱۸۱۴-۱۸۶۹ء) کے فرزند تھے۔ ولادت دہلی ۲۵ اپریل ۱۸۳۳ء۔ ان کی تعلیم غالب کی نگرانی میں ہوئی جو علائی کو بہت عزیز رکھتے تھے۔ فارسی، ترکی اور عربی کی استعداد عالمانہ تھی۔ اُردو، فارسی میں شعر کہتے تھے۔ ۳۶ سال کی عمر میں والد کی حیات میں ہی لوہارو کی گدی میں بٹھا دیئے گئے۔ علائی کی وفات ۳۱ اکتوبر ۱۸۸۴ء ہوئی۔

میرزا شہاب الدین احمد ثاقب دہلوی:

نواب ضیاء الدین احمد خاں نیر، رخشاں کے بڑے صاحبزادے ۱۸۴۰ء میں پیدا

ہوئے- والد کی نگرانی میں تعلیم وتربیت ہوئی - اپنی قابلیت اور لیاقت کی بدولت جلد ہی ممتاز ہو گئے- انگریزی حکومت نے انھیں دہلی میں آنریری مجسٹریٹ مقرر کیا- غالب کی وفات کے دو ماہ بعد ۱۹ اپریل ۱۸۶۹ء کو فوت ہو گئے- ثاقب تخلص غالب کا دیا ہوا ہے جو شہاب کی مناسبت سے ہے-

میرزا قربان علی بیگ سالک دہلوی:

پیدائش حیدرآباد (دکن) میں ہوئی- والد (مرزا عالم علی بیگ) کی ملازمت کے اختتام پر بچپن میں دہلی آ گئے تھے اور یہیں نشو ونما اور تعلیم وتربیت ہوئی - ریاست الور میں خدمت وکالت پر مامور رہے- یہاں سے فارغ ہو کر حیدرآباد چلے گئے اور صیغہ تعلیمات میں سررشتہ دار مقرر ہوئے- نواب عماد الملک (سید حسین بلگرامی) کی سرپرستی میں ایک رسالہ "مخزن الفوائد" جاری کیا جو عرصے تک علم وادب کی خدمت کرتا رہا- سالک نے پندرہ سال کی عمر میں شعر کہنا شروع کیا- آغاز میں حکیم مومن خاں کو کلام دکھایا- پھر غالب سے مشورہ کرنے لگے- پہلے قربان تخلص کیا- غالب نے اسے بدل کر سالک کر دیا- ۵۷ سال کی عمر میں ۱۸۸۱ء میں حیدرآباد میں فوت ہوئے- (ولادت: ۱۸۲۴ء؟)

منشی ہرگوپال تفتہ، سکندرآبادی:

بھٹناگر کائستھ دیپ چند کی اولاد میں سے موتی لال بھٹناگر کے آٹھ بیٹوں (اٹھ گھرے) میں سے ایک ہرگوپال تھے- ۱۷۹۹ء (۱۲۱۴ھ) میں پیدا ہوئے- ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی- فارسی کا شوق تھا- انگریزی محکمہ بندوبست میں قانون گو رہے مگر شاعری کے شوق میں ملازمت کو خیرباد کہا- کچھ عرصہ ریاست جے پور میں ملازمت کی اور جلد ہی اُسے بھی چھوڑ دیا- ۲ ستمبر ۱۸۷۹ء کو فوت ہوئے- تفتہ ابتدا میں رامی تخلص کرتے تھے- جب غالب کی شاگردی اختیار کی تو غالب نے تخلص بدل کر تفتہ اور مرزا کا خطاب دے کر مرزا تفتہ بنا دیا- تفتہ غالب کے محبوب شاگردوں میں سے تھے- تفتہ عمر بھر فارسی میں شعر کہتے رہے اور فارسی میں چار دیوان یادگار چھوڑے-

مرزا حاتم علی بیگ مہر:

مہر ۱۸۱۵ء/ ۱۲۳۰ھ میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ اُن کے والد فیض علی بیگ انگریزی عملداری میں تحصیلدار تھے۔ کم عمری میں والد فوت ہو گئے۔ والدہ نے اچھی تعلیم دلوائی۔ ۱۸۴۰ء میں قانون کا امتحان پاس کر کے منصف مقرر ہوئے (چنار گڑھ)۔ مہر ناسخ کے شاگرد ہوئے۔ انگریزی حکومت نے اُن کی خدمات کے اعتراف میں اعزاز بھی دیا اور دو گاؤں بطور جاگیر عطا کیے۔ مہر لکھنؤ سے آگرہ آ گئے اور وہاں وکالت شروع کر دی۔ ۱۸۷۹ء میں فوت ہوئے۔

منشی شیو نرائن آرام:

آگرہ میں پیدا ہوئے۔ ولادت: ۱۰ ستمبر ۱۸۳۳ء۔ بچپن میں والدہ فوت ہو گئیں۔ آرام کی تعلیم و تربیت اچھے پیمانے پر ہوئی۔ آگرہ کالج میں اعلیٰ تعلیم حاصل کی انگریزی اور فارسی کی تکمیل کی۔ فارغ التحصیل ہو کر اسی کالج میں انگریزی کے مدرس مقرر ہوئے۔ (۱۸۵۶ء) دو سال بعد محکمہ آبکاری میں ملازم ہوئے اور پھر کئی دوسرے محکموں میں کام کیا۔ منشی جی کے نام سے مشہور تھے۔ رفاہ عام کے کاموں میں سرگرم حصہ لیتے رہے۔ اُن کی علمی سرگرمیوں میں مطبع مفید الخلائق کا خاص مقام ہے جس میں غالب کی دو کتابیں دستنبو (۱۸۵۸ء) اور دیوان اُردو (۱۸۶۳ء) شائع ہوئیں۔ ۱۸۷۷ء میں رائے بہادر کا خطاب ملا۔ ۴ ستمبر ۱۸۹۸ء کو فوت ہوئے۔

میر مہدی حسین مجروح:

پیدائش دہلی ۱۸۳۳ء۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں پانی پت چلے گئے۔ امن قائم ہوا تو دہلی آئے۔ پھر تلاش روزگار کے لیے الور، جے پور میں رہے آخر رام پور میں آ کر اقامت کی۔ رام پور میں بقیہ ایام آرام سے گزرے۔ آخری عمر میں بینائی جاتی رہی۔ رام پور ہی میں ۱۵ مئی ۱۹۰۳ء (۱۷ صفر ۱۳۲۱ھ) کو فوت ہوئے۔ غالب کے بہت محبوب شاگردوں میں سے تھے۔ "مظہر معنی" (دیوان) مطبوعہ ۱۸۹۹ء جس کا اہتمام میرن صاحب نے کیا جو میر مجروح کے شریک مکتوب الیہ اور اُن کے یار غار تھے۔

خواجہ غلام غوث خاں بیخبر:

اجداد کشمیر کے رہنے والے تھے۔ مغلوں کے زوال کے بعد امن و سکون درہم برہم ہوا

تو ترک وطن کیا- خواجہ غلام غوث کی ولادت ۱۲۴۱ھ (۱۸۲۴ء) میں ہوئی- ابتدائی تعلیم بنارس میں ہوئی- اُن کے ماموں آگرہ واودھ کے گورنر کے میر منشی تھے- بے خبر بھی ۱۸۴۱ء میں انہی کے دفتر میں ملازم ہوئے- ماموں کی سبکدوشی کے بعد انہیں میر منشی بنا دیا گیا- ۱۸۸۵ء تک اسی عہدے پر فائز رہے- پنشن کے بعد آگرہ سے الہ آباد آ گئے اور وہیں ۲۶ دسمبر ۱۹۰۴ء (۱۳۲۲ھ) کو فوت ہوئے-

انورالدولہ شفق، نواب محمد سعد الدین، رئیس کدورہ، کالپی-

وفات ۱۸۸۲ء (۱۲۹۸ھ) کلام پختہ تھا- غالب سے پہلے تعلق سے مشورِ سخن کیا- ایک نثری رسالہ، ایک دیوان اور ایک مثنوی یادگار ہے- نبی کریم ﷺ کی مدح میں ایک مولود منظوم بھی ''مخزن سعادت'' کے نام سے ۱۸۵۳ء میں شائع کیا-

حکیم غلام نجف خاں ولد مسیح الدین

(حالات؟) پانچ برس کی عمر میں دہلی آئے- حکیم احسن اللہ خاں سے طب کی تعلیم پائی اور انہی کے توسط سے میرزا غالب سے تعلق ہوا- اُن سے فارسی کتب طب پڑھیں- غالب بھی اُنہیں اپنے اہل خانہ میں شمار کرتے تھے اور عزیز رکھتے تھے-

نواب یوسف مرزا (تخلص، ناصر):

سید ناصر الدین حیدر خاں نام، عرف یوسف مرزا لکھنوی- نواب حسام الدین حیدر خاں کے نواسے اور ناظر حسین مرزا کے بھانجے تھے جن کی بڑی بہن سید محمد نصیر عرف نواب جان سے بیاہی گئیں- یوسف مرزا انھیں نواب جان کے بیٹے تھے- یوسف مرزا ۱۸۵۷ء کے بعد عرصے تک پریشان رہے- اُن کے باپ کو پھانسی ہو گئی تھی- آخر انھیں الور میں پناہ ملی- مہاراجہ ان سے بہت خوش تھے- پچاس روپے ماہوار وظیفہ مقرر تھا- اقامت کی پابندی نہ تھی- طبیعت میں ظرافت تھی- ۱۳۰۰ھ (۱۸۸۲ء-۱۸۸۳ء) میں وفات پائی- لکھنؤ میں دفن ہوئے-

نواب میر غلام بابا خاں:

۶ دسمبر ۱۸۳۴ء (۴ شعبان ۱۲۵۰ھ) سورت میں پیدا ہوئے- ۱۹ اپریل ۱۸۹۳ء (۱۲ شوال ۱۳۱۰ھ) کو فوت ہوئے- اُن کے والد قاضی شہر اور درگاہ سید جمال الدین کے سجادہ نشین

تھے- شاعر نہیں تھے مگر شعرا کے قدر دان تھے- غالب سے بھی خط و کتابت رہی اور گاہے ماہے اُن سے سلوک بھی کرتے رہے-

میر ابراہیم علی خاں وفا سہسوانی:

میر اکبر علی خان کے بڑے بیٹے تھے- غالباً ۱۸۳۵ء میں پیدا ہوئے- ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی- والد کے انتقال پر ۱۸۶۰ء میں جانشین ہوئے اور ۱۸۸۵ء میں بڑودہ میں فوت ہوئے- (جہاں اُن کے جد اعلیٰ میر سرفراز علی خان نقل مکان کر کے آ گئے تھے-) میر ابراہیم علی خاں کو یہاں جاگیر ملی ہوئی تھی-

حکیم سیّد احمد حسن مودودی ولد سید محمد حسن صالحی-

وطن سہسواں، ولادت ۱۲۴۵ھ/ ۱۸۲۸ء (؟) ابتدائی تعلیم وطن میں پائی اور تکمیل دہلی میں کی- غالب کے شاگرد ہوئے- پھر بڑودہ چلے گئے- وہاں طب کی تعلیم حاصل کی اور مطب شروع کیا- ریاست بڑودہ میں ملازم ہو گئے اور وہیں سکونت اختیار کر لی- ۱۳۱۰ھ/۱۸۹۴ء میں فوت ہوئے-

منشی محمد تفضّل حسین خاں:

(کوکب تخلص) (غالب کا ایک دہلوی شاگرد) (حالات نہیں ملتے)- ۱۸۵۷ء کے خونیں ہنگامے کے بعد دہلی والوں نے ایک مشاعرہ کیا تھا جسے ''فغان دہلی'' کے عنوان سے کوکب دہلوی نے ۱۲۷۹ھ میں مرتب کیا- جسے اکمل المطابع دہلی نے ۱۲۸۰ھ/۱۸۶۴ء میں شائع کیا تھا- تقریظ از مرزا قربان علی بیگ سالک- (طبع ثانی: اکادمی پنجاب لاہور ۱۹۵۳ء)

میاں داد خاں سیّاح اورنگ آبادی:

یار باش اور زندہ دل آدمی تھے- مزاج میں بہت لطافت تھی- فارسی زبان بے تکان بولتے تھے- سیاحت کا شوق تھا- جہاں جاتے لوگوں سے بے تکلف دوستی پیدا کر لیتے- اپنے اہتمام سے مشاعرے کرتے، پڑھنے کا انداز بھی دلکش تھا- اچھے خطاط اور فن مصوری کے ماہر تھے- شروع میں تخلص عشاق تھا- غالب نے بدل کر سیاح کر دیا- غالب نے انھیں سیف الحق خطاب بھی دیا-

میر حبیب اللہ ذکا' مدراسی ثم حیدر آبادی:

مولد' اووگیر (ضلع نیلور-مدراس) ۱۸۳۰ء (۱۲۴۴ھ) میں پیدا ہوئے-ابتدائی تعلیم اپنے بڑے بھائی محمد رحمت اللہ رسا سے حاصل کی-علوم متداولہ دیگر اساتذہ سے پڑھے-فارسی پر خاصی قدرت تھی اور عربی بھی جانتے تھے-شاعری کا ابتدا سے شوق تھا-غالب کی شاگردی کے بعد پہلا کلام ضائع کر دیا-۱۲۷۲ھ (۱۸۵۵ء) میں ۲۸ سال کی عمر میں حیدر آباد آئے-۱۸۷۴ء (۱۲۹۱ھ) میں فوت ہوئے-

چودھری عبدالغفور سَرُوؔر مارہروی:

مرزا غالب کے مخلص دوست و نیاز مند-اُنھیں سب سے پہلے غالب کے خطوط کی اشاعت کا خیال آیا مگر اُنھوں نے مرزا تفتہ اور شیو نرائن آرام' کی طرح اجازات لینے کی بجائے خطوط کی جمع آوری کا کام شروع کر دیا-اور ''مہر غالب'' کے نام سے اسے ترتیب دے ڈالا-یہ مرزا غالب کا پہلا مجموعہ مکاتیبِ اُردو ہے-سرور مارہرہ (ضلع ایٹہ-یو-پی) کے رئیس تھے اور قوم کے کمبوہ-بقول غلام رسول مہر' سرور کا انتقال بیسوی صدی کے اوائل میں ہوا-

مآخذ:

۱- تلامذۂ غالب-مالک رام-

۲- خطوط غالب' جلد اوّل' جلد دوم-غلام رسول مہر' ۱۹۶۹ء (مطبوعات یادگار غالب)

پیشکش: بزم اقبال
بسلسلۂ اقبالیات

اقبال: شخصیت اور شاعری

از پروفیسر حمید احمد خاں (مرحوم)
مجلد: صفحات ۱۶۸ — قیمت -/۷۰ روپے

اقبال اور ملی تشخص

از پروفیسر ڈاکٹر سید محمد اکرم "اکرام"
نفیس ریکسین کی جلد: صفحات ۳۵۶ - قیمت -/۲۰۰ روپے

اقبال ایک مطالعہ

از پروفیسر ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار
مجلد: صفحات ۲۹۶ - قیمت -/۱۲۰ روپے

اقبال کا ذہنی وفکری ارتقا (سرگذشت اقبال)

از پروفیسر ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار
نفیس ریکسین کی جلد: صفحات ۲۴۸ قیمت -/۱۵۰ روپے
(سیٹ خریدنے پر خصوصی رعایت ۲۵ فیصد کے ساتھ)

بزمِ اقبال کی تازہ ترین پیش کش
(۲۰۰۳ء)

تفہیم بالِ جبریل

از

پروفیسر ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا

نفیس کاغذ - خوبصورت ومضبوط جلد - دیدہ زیب طباعت

صفحات ۴۲۸ - بڑا سائز (۲۰×۳۰)
قیمت: چارسو روپے

طلبہ واساتذہ کے لیے خصوصی رعایت کے ساتھ

آزادی کی کہانی، اقبالؒ اور قائداعظم کی زبانی

قائداعظم محمد علی جناح اور علامہ اقبال جہادِ آزادی کے وہ ایسے عظیم رہنما ہیں جن کے فرمودات ہمیشہ مشعلِ راہ ہوں گے۔

بزمِ اقبال کی مندرجہ ذیل مطبوعات (اُردو و انگریزی) ملاحظہ فرمائیے:

۱- قائداعظم کی تقاریر و بیانات (انگریزی) چار جلدوں میں۔
صفحات: پونے تین ہزار — قیمت فی جلد ۳۵۰ روپے

۲- قائداعظم کی تقاریر و بیانات (اُردو ترجمہ) چار جلدوں میں۔
صفحات: ڈھائی ہزار — قیمت جلد اوّل: ۲۰۰ روپے
قیمت جلد دوم، سوم، چہارم: ۲۵۰ روپے

۳- پاکستان: تصور سے حقیقت تک
علامہ اقبال اور قائداعظم کے افکار و فرمودات کی روشنی میں:
مجلد، صفحات: ۳۸۴ — قیمت ۲۰۰ روپے

4 PAKISTAN: As Visualized by Iqbal & Jinnah.
Pages: 320, Price Rs. 200/-

[رعایت: بزمِ اقبال کے قواعد کے مطابق۔ طلبہ کے لیے خصوصی رعایت]

بزمِ اقبال- ۲ کلب روڈ، شارع قائداعظم، لاہور
فون: 6363056